اردو ادب میں نسائی تنقید

(روایت، مسائل و مباحث)

ڈاکٹر عظمیٰ فرمان فاروقی

Scanned by CamScanner

اردو ادب میں نسائی تنقید

(روایت، مسائل و مباحث)

IHSAN UL HAQ (BS-URDU)

ڈاکٹر عظمیٰ فرمان فاروقی

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہء اردو، جامعہ کراچی

Scanned by CamScanner

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں

کتاب	:	اردو ادب میں نسائی تنقید
اشاعت اول	:	اگست ۲۰۱۰ء
مصنفہ	:	ڈاکٹر عظمیٰ فرمان فاروقی
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۲۰۰/- روپے

IHSAN UL HAQ (BS-URDU)

ناشر

سعید پبلی کیشنز

کراچی

Personal Library
IHSAN UL JAQ
0313-9443348

Scanned by CamScanner

انتساب

اماں

اور

ابا جی

کے نام

Scanned by CamScanner

فہرست

- ابتدائیہ 7

باب اوّل 10

نسائیت ایک تعارف

- نسائیت کیا ہے 11
- حواشی وحوالہ جات 26

باب دوم

جنوبی ایشیا (پاک وہند) میں نسائیت/فیمینزم کی تحریک

اور اردو ادب

- تاریخی پس منظر 30
- تعلیم نسواں کی تحریک 36

Scanned by CamScanner

- اصلاحی نسائیت 39
- تحریک آزادی کی نسائی آوازیں 50
- ترقی پسند نسائیت 59
- دیگر ادبی رجحانات اور تحاریک 69

حواشی وحوالہ جات 71

باب سوم

اردو کا نسائی/ Feminist دبستان تنقید

- نسائی تنقید (تعریف، روایت) 78
- حواشی وحوالہ جات 111

- کتابیات 114

IHSAN UL HAQ (BS-URDU)

Personal Library
IHSAN UL JAQ
0313-9443348

Scanned by CamScanner

ابتدائیہ

''اردو کی ادبی تحقیق وتنقید میں خواتین کا حصہ'' یہ میرے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع تھا۔ جب میں نے ۱۹۹۳ء میں یہ موضوع منتخب کیا تھا تو خیال تھا کہ اس مطالعے کا ایک فیمنسٹ رخ بھی سامنے آئے گا لیکن جب مقالے کا مواد اکٹھا کیا تو اندازہ ہوا کہ خواتین محققین اور ناقدین کے ہاں فیمنزم کا رجحان اس انداز میں نظر نہیں آتا جس انداز میں شاعری یا فکشن میں نظر آچکا تھا۔ شاعری میں سارا شگفتہ، کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض جیسے نام موجود تھے۔ فکشن میں بھی رشید جہاں، عصمت چغتائی، قراۃ العین حیدر، زاہدہ حنا جیسی خواتین موجود تھیں۔ ان سب خواتین کے تخلیقی رویوں میں نسائیت یا فیمنزم صاف نظر آرہی تھی لیکن تحقیق یا تنقید کی یہ نوعیت نہیں تھی۔

تحقیق اور تنقید میں فیمنسٹ رویہ دیر سے نظر آنے کی ایک وجہ تو یہ تھی تحقیق اور تنقید، بالخصوص تحقیق ایک غیر جذباتی کام ہے۔ معروضیت اور غیر جانبداری، تحقیق کے لئے شرط اولین ہے اس لئے خواتین نے ایسے موضوعات کی طرف توجہ دی جس پر کام کرتے ہوئے ان پر جانبداری کا شبہ نہ کیا جاسکے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تنقید اور تحقیق کے میدان میں اکثریت مرد حضرات کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ محض اتفاق ہے یا اس کے پیچھے بھی پدری معاشرے کی سیاست کارفرما ہے لیکن یہ حقیقت بہت صاف ہے کہ جامعات میں خواتین اساتذہ کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ، تحقیق وتنقید میں نسائیت یا فیمنزم کا رجحان بڑھتا گیا۔ ایک اور وجہ شاید یہ بھی تھی کہ تحقیق اور تنقید ایک محنت طلب اور دشوار گزار عمل سمجھا جاتا تھا جو صرف مرد ہی انجام دے سکتے تھے۔ اس تصور کو باطل ثابت کرنے کے لئے عورتوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ان موضوعات پر تحقیقی وتنقیدی کام کیا جو مشقت طلب ہونے کے باعث مردوں کیلئے مخصوص سمجھے جاتے تھے مثلاً تدوین متن کے کام یا عروض، جمالیات، مستشرقین وغیرہ کے حوالے سے تحقیق یا تنقید۔

Scanned by CamScanner

۱۹۹۷ء میں میرے تحقیقی مقالے کی تکمیل تک اردو تنقید اور تحقیق میں ایک دو انفرادی کاموں کو چھوڑ کر کسی واضح فیمنسٹ رجحان کی نشاندہی ممکن نہ تھی۔ تاہم پچھلے دس بارہ سالوں میں اردو تنقید و تحقیق کا ایک فیمنسٹ رخ صاف دیکھا جا سکتا ہے اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان خواتین نے تنقید کی طرف توجہ کی جو تخلیقی سطح پر پہلے ہی فیمنسٹ رویوں کا اظہار کر چکی تھیں۔ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، فاطمہ حسن، تنویر انجم، یاسمین حمید۔ یہ سب خواتین اپنی شاعری یا نثر میں نسائی لب و لہجہ اختیار کر چکی تھیں اور اس لب و لہجے کو جب انہوں نے تنقید میں برتا تو اردو میں گویا ایک فیمنسٹ دبستان تنقید کی بنیاد رکھی گئی۔

آج یہ نسائی دبستان اگرچہ ابتدائی مرحلوں میں ہے لیکن امکانات کا ایک وسیع و عریض میدان نسائی نقاد کے آگے کھلا پڑا ہے۔ یقیناً نئے نسائی تنقید آگے بڑھے گی اور تیزی سے بڑھی گی۔ اس کتاب میں صرف یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اردو تنقید میں نسائیت کے ابتدائی رجحان کو اس کے تاریخی، سیاسی اور سماجی پس منظر کے ساتھ محفوظ کر لیا جائے تا کہ آئندہ نسلوں کے لئے اردو میں فیمنسٹ تنقید کی تاریخ مرتب کرنا آسان ہو سکے۔

۲۰۰۷ء میں جب پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال صاحب نے شعبہ اردو میں تنقید کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا تو میری دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نسائی تنقید کے مسائل و مباحث پر مقالہ پڑھنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی اس مقالے کی تیاری کے لئے میں نے شعبہ اردو کی سیمینار لائبریری اور جامعہ کراچی کی محمود حسین لائبریری سے خاص طور پر استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ میرے وہ نوٹس بھی تھے جو میں نے کینیڈا میں قیام کے دوران ٹورنٹو پبلک لائبریری کی کتابوں کی مدد سے تیار کیے تھے۔ بعض رفقائے کار جو اس مقالے کی تیاری اور میرے پاس جمع مواد سے واقف تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ اس مقالے کو وسعت دے کر کتاب کی صورت دے دی جائے تا کہ فیمنزم کے بارے میں جو غلط مبحث کی صورت ہے وہ دور ہو اور اکیڈمک سطح پر نسائی تنقید کے مطالعے میں سہولت پیدا ہو سکے۔

Scanned by CamScanner

ان مشوروں کی روشنی میں اس کتاب کا ڈول ڈالا گیا۔ اس مختصر سی کتاب کی نوعیت تعارفی ہے۔ پہلے باب میں نسائیت کی تعریف متعین کرنے کے ساتھ ساتھ مغربی ادب میں نسائیت کی تحریک کا مختصر جائزہ قلمبند کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں برعظیم پاک و ہند میں رونما ہونے والے ان واقعات اور رجحانات کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہوں نے نسائی تحریک کے لئے راہ ہموار کی۔ اس خطے میں آریوں کی آمد، عربوں، مغلوں، ترکوں اور پھر انگریزوں، پرتگالیوں اور فرانسیسیوں وغیرہ کی آمد، اس کے بعد جنم لینے والی جدید تحاریک، سرسید اور ترقی پسند تحریک، تحریک آزادی اور اس کے بعد کے حالات، یہ سب واقعات عورت کی حیثیت اپنے اپنے طور پر کیسے طے کرتے رہے ہیں ان سب کا احاطہ دوسرے باب میں کیا گیا ہے۔

تیسرا اور آخری باب اردو میں فیمنسٹ تنقید کے بارے میں ہے۔ نسائی تنقید کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کے بعد اردو ادب کی تنقیدی روایت کا ایک مختصر جائزہ لیا گیا ہے تاکہ اس پس منظر میں نسائی تنقید کی اہمیت اور خصوصیات واضح ہو سکیں۔ اردو کی نسائی تنقید پر گفتگو پچھلے دس بارہ سالوں پر محیط ہے کیونکہ یہی وہ عرصہ ہے جس میں اردو نسائی تنقید اپنے خدوخال واضح کرتی ہے اور اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے۔

اس مقالے کی تشکیل و اشاعت میں میرے رفقائے کار اور اساتذہ ہر ہر قدم پر میرے مددگار و معاون رہے۔ میری دوست اور جناح یونیورسٹی برائے خواتین میں شعبہ اردو کی سربراہ عائشہ کفیل کا بھی شکریہ جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت کا کام بہت سرعت کے ساتھ انجام دیا اور آخر میں میرے شوہر وسیم احمد فاروقی میرے بچوں فریس احمد، یاسر احمد فاروقی اور بسمہ احمد اور میرے والدین کا بھی شکریہ جن کا تعاون اور دعائیں قدم قدم پر میرے ساتھ رہی ہیں۔

عظمیٰ فرمان

Scanned by CamScanner

باب اوّل

نسائیت ایک تعارف

- نسائیت کیا ہے
- نسائیت / فیمنزم کی اہم شاخیں
- جدید علوم وفنون اور نسائیت کا دبستان
- حواشی وحوالہ جات

IHSAN UL HAQ (BS-URDU)

Scanned by CamScanner

نسائیت ایک تعارف

نسائیت کیا ہے؟

نسائیت / تانیثیت / فیمنزم کی متعدد تعریفیں متعین کی جا سکتی ہیں اور کی جا چکی ہیں۔ مثال کے طور پر انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کے مطابق

> ''فیمنزم ایک سماجی تحریک ہے جو عورتوں کے مساوی حقوق کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔''[۱] ایک لغت میں فیمنزم کی تعریف اس طرح درج ہے ''فیمنزم سیاسی، معاشی اور سماجی حوالے سے جنسی / صنفی (gender) مساوات کا نظریہ ہے''[۲]

ایک اور تعریف اس طرح ہے کہ

> ''فیمنزم ایک نظریاتی وابستگی بھی ہے اور ایک سیاسی تحریک بھی جو عورتوں کے لئے انصاف کے حصول اور معاشرے سے جنسی / صنفی امتیازات کے خاتمے کے لئے کوشاں ہے''۔[۳]

یا یہ کہ

> ''فیمنزم عورتوں کے حقوق اور مفادات کے لئے کام کرنے والی تحریک ہے''[۴]

نینسی کاٹ (Nancy Cott) کے خیال میں جنسی / صنفی مساوات پر یقین رکھنے اور عدم مساوات کے تصور پر قائم موجودہ نظام کو رد کر دینے کا نام فیمنزم ہے۔[۵]

اسی طرح ایک نقاد کا خیال ہے کہ نسائیت یا فیمینزم دراصل کوئی ایک تحریک یا نظریہ نہیں

Scanned by CamScanner

بلکہ کئی تحریکات اور نظریات کا مجموعہ ہے۔

"Feminism is a discourse that involves various movements, theories and philosophies which areconcerned with issues of gender difference, advocate equality for women and campaign for women rights and interests." [۱]

مندرجہ بالا تمام عبارتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فیمنزم ایک فلسفہ حیات اور انداز فکر کا نام بھی ہے اور ایک عملی تحریک بھی ہے لیکن اس کے باوجود اس کے پیچھے نہ کوئی تنہا نظریہ یا فلسفہ موجود ہے اور نہ ہی اس میں باقاعدہ منظم جدوجہد کا وہ تصور نظر آتا ہے جو ''تحریک'' کی اصطلاح سے وابستہ ہے۔ اسی لئے ہر شخص ''نسائیت'' یا فیمنزم کا ایک نجی تصور اپنے ذہن میں رکھتا ہے۔ یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر فیمنزم کی اصطلاح اس قدر وسیع یا بالفاظ دیگر اس قدر ڈھیلی ڈھالی ہے تو پھر وہ کونسی خصوصیات ہیں یا وہ کون سے رجحانات ہیں جن کی بنیاد پر کسی عمل یا تحریر یا شخص کو Feminist قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینا تب ہی ممکن ہے جب ہم ان تمام نظریات و خیالات میں کوئی مقام اتصال تلاش کر سکیں جو فیمنسٹ کہلاتی ہیں اور وہ نکتہ جہاں پر یہ اتصال ممکن ہے صرف ایک ہی ہے۔ یعنی

''عورتوں کے حقوق کا حصول اور سوسائٹی کی hierarchy میں منصفانہ تبدیلی''۔[۷]

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس جدوجہد کے دو رخ ہیں۔

۱۔ فلسفیانہ یا نظریاتی

۲۔ عملی

فیمنزم کے عملی رخ کی بات ہوتی ہے تو مغرب میں رونما ہونے تحریک ذہن میں آتی ہے جس کا اثر اردو ادب سمیت دنیا بھر کے علوم اور فنون پر مرتب ہوا۔

IHSAN UL HAQ BS URDU

Scanned by CamScanner

مغرب میں فیمنزم کی اس تحریک کو عموماً نظریہ موج (wave concept) کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ اس تصور کے تحت نسائیت یا فیمنزم میں تین امواج یا waves نظر آتی ہیں۔ پہلی موج کا عرصہ انیسویں صدی عیسوی سے بیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل تک ہے۔ اس عرصے میں عورتوں کی ملازمت، یکساں اجرت، جائیداد اور ملکیت کے حقوق، بیوی کے حقوق اور ووٹ کا حق جیسے مسائل کے لئے عملی جدوجہد ہوئی۔

دوسری موج کی عملی صورت ۱۹۶۲ء سے ۱۹۹۸ء کے درمیان واضح ہوتی ہے۔ اس عرصے میں نجی اور گھریلو مسائل کو سیاسی مسائل قرار دیا گیا۔ کیرل ہانش نے The personal is political کا نعرہ بلند کیا۔[۸] اور عورتوں میں اس خیال کی ترویج و اشاعت کی گئی کہ ان کے نجی معاملات دراصل ایک سیاسی مسئلے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اسی دور میں ''آزادیٔ نسواں'' کا تصور سامنے آیا۔ گھریلو کاموں، بچوں کی ولادت اور تربیت اور ضعیفوں کی خدمت جیسے کاموں کی قدر اور قیمت متعین کرنے کے سوالات اٹھائے گئے۔

۱۹۹۹ء کے بعد سے آج تک تیسری موج کا عہد تصور کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں فیمنزم کی عملی تحریک کے بے شمار رخ ہیں جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔

یہ تو مغربی فیمنزم کا عملی رخ تھا لیکن یہ پہلو فیمنزم کے نظریاتی رخ سے پوری طرح جڑا ہوا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ فیمنزم کی عملی تحریک کے پیچھے ان فلسفیانہ نظریات اور مباحث کا بڑا حصہ ہے جو فیمنسٹ ادیبوں نے اپنی تصانیف میں پیش کیے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ فیمنزم کے ارتقاء کا مطالعہ نظریاتی اور فکری مباحث کے پس منظر میں بھی کیا جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ مغرب سے شروع ہونے والی فیمنزم کی تحریک کی ابتدا تو اٹھارویں صدی میں ہو چکی تھی مگر دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس تحریک نے خاص طور پر زور پکڑا اور عملی کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ اس سلسلے کا پہلا اہم اظہار یہ ۱۷۹۲ء میں شائع ہوا جسے Mary Wallstone Craft نے تحریر کیا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔

Scanned by CamScanner

"A vindication of The Rights of Women"[9]

۱۸۴۵ء میں مارگریٹ فلر نے "Women in the 19th Century" لکھی۔[۱۰]

تین سال بعد ۱۸۴۸ء میں مشہور Seneca Falls کنونشن میں عورتوں کے مساوی حقوق کا باقاعدہ مطالبہ کر دیا گیا[۱۱]۔ ۱۸۶۹ء میں John Staurt Mill کی مشہور کتاب "The subjection of Women" شائع ہوئی جس کا ترجمہ افتخار شیروانی نے ''عورتوں کی محکومیت'' کے عنوان سے کیا ہے[۱۲]۔ اس کے بعد آزادیٔ نسواں کا تصور تیزی سے مقبول ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے بالآخر امریکہ میں عورت کو ووٹ دینے کا حق مل گیا[۱۳]۔ تاہم اس کے بعد بھی مغربی معاشرے میں ملازمتوں میں عورتوں کی شمولیت محدود رہی۔ دوسری جنگِ عظیم تک مغربی معاشرے میں عورت کا گھر سے تلاشِ معاش میں نکلنا ایک معیوب سی بات سمجھی جاتی تھی۔ یہ حالتِ مجبوری ملازمت تلاش کرنے والی عورتیں نچلے درجے کی نوکریوں پر کم اجرت پر رکھی جاتی تھیں۔ یہ سب برداشت کر لینے کے بعد بھی بے شمار دشواریاں اور سماجی و معاشرتی مسائل، ملازمت پیشہ عورتوں کی زندگی کو کٹھن بنانے اور عملی زندگی میں ان کی حوصلہ شکنی کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔[۱۴]

اس صورتِ حال میں ورجینیا وولف (Virginia Wooif) میں ایک طویل مضمون 'A Room of One's Own (1929) تحریر کیا جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی دوسری جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۴۹ میں فرانسیسی ادیبہ سائمن ڈی بووا کی کتاب The Second Sex سامنے آئی۔[۱۵] یہ کتاب فیمنزم کا بے حد اہم سنگِ میل سمجھی جاتی ہے۔ اسی کتاب میں نسائی وجودیت کی انقلاب انگیز بحث اٹھائی گئی تھی۔ سائمن ڈی بووا نے عورت کے وجود سے متعلق کئی مباحث چھیڑے مثلاً یہ کہ ''عورت کیا ہے؟'''' کیا عورت کا وجود قائم بالذات ہے یا اضافی؟ کیا صنفِ مخالف کی موجودگی سے ہی اس کے وجود کا تعین ممکن ہے؟ اور اگر تذکیر کے بغیر تانیث کا وجود نہیں تو پھر اس قاعدے کی رو سے تذکیر بھی اپنے وجود کے تعین کے لئے تانیث کی محتاج ہے۔ تو

Scanned by CamScanner

پھر ایسا کیوں ہے کہ عورت ہی مرد کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے؟ اور مرد کے لئے عورت کی نسبت سے پہچانا جانا تذلیل کی بات سمجھی جاتی ہے۔؟

اپنی دوسری کتاب Women: Myth & Reality میں سائمن ڈی بووا نے عورت اور مرد کے روایتی تصور کو رد کر دیا۔ اس کا خیال ہے کہ مرد کو اپنی مردانگی اور عورت کو اپنی نسوانیت جتانے یا ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بجائے مرد اور عورت دونوں اپنی انسانیت ثابت کریں تو بہتر ہے کیونکہ اس کے خیال میں ''عورت پیدا نہیں ہوتی بن جاتی ہے'' [۱۶] سائمن ڈی بووا کو سارتر کے سائے سے نکالنے اور اس کا علیحدہ وجود ثابت کرنے کے لئے بھی فیمنسٹ نقادوں کو طویل عرصہ جدوجہد کرنی پڑی بہر حال سائمن ڈی بووا کی تحریروں نے نسائیت کا وجودیت اور نفسیات سے جو رشتہ استوار کیا اسے بعد میں آنے والوں نے مزید مضبوط کیا۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں کئی فیمنسٹ تحریریں سامنے آئیں۔ بیٹی فرائڈن (Betty Friedan) کی کتاب "The Feminine Mystique" ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔ اپنے عہد کی یہ بے حد مقبول مگر متنازعہ کتاب رہی۔ [۱۷] بیٹی فرائڈین نے صدیوں پرانے اس معاشرتی تصور پر ضرب لگائی کہ گھر اور بچوں کے ذریعہ عورت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ایسے روایتی باطل تصورات کا شکار ہو کر عورت اپنی شناخت گم کر بیٹھتی ہے۔ [۱۸]

اس کے بعد کئی دیگر کتابیں جلد ہی منظرِ عام پر آئیں جنہوں نے نسائیت کی بحث کو آگے بڑھایا مثال کے طور پر

۱۔ Mary Ellman کی کتاب "Thinking about Women" (1968)[۱۹]

۲۔ Kate Millet کی "Sexual Politics" (1969)[۲۰]

۳۔ Judith Fetterly کی "The Resisting Reader" (1977)[۲۱]

۴۔ Elaine Showalter "A Literature of Their Own" (1977)"[۲۲]

ان مصنفین کے بعد وہ عہد شروع ہوتا ہے جسے Third Wave یا تیسری موج کہا جاتا

Scanned by CamScanner

ہے۔ یہ تینوں امواج ایک دوسرے کا تسلسل بھی ہیں اور بیک وقت ایک ساتھ بھی فیمنزم کے تناظر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ فیمنزم کی اس تیسری موج میں جو آج تک جاری ہے کئی نظریاتی مباحث سامنے آئے اس عہد میں نسائیت / فیمنزم کے تضادات اور ابہامات پر گفتگو کی گئی۔ نسائی ادیبوں کی انفرادیت، تحلیل نفسی اور رد تشکیل کے مسائل پر بحث کی گئی اور نسائیت کا رشتہ دیگر علوم سے جوڑ دیا گیا۔[۲۳]

عالمگیریت کے اس عہد میں کوئی علم، فن یا نظریہ ایسا نہیں جس کا تعلق دیگر علوم و فنون سے استوار نہ ہو۔ فیمنزم بھی آج ایک دبستان فکر ہے جس کا اثر تمام شعبہ ہائے زندگی پر نظر آتا ہے۔ دوسری طرف دیگر علوم اور نظریات کے زیر اثر خود نسائیت / فیمنزم کے کئی ذیلی مکاتب ہائے فکر جنم لے چکے ہیں اور فیمنزم کی کئی شاخیں وجود میں آ چکی ہیں۔ فیمنزم کی شاخوں میں تقسیم کئی حوالوں سے ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور ایک بڑی تقسیم اس بحث کے نتیجے میں سامنے آئی کہ آیا عورت پیدا ہوتی ہے یا بنا دی جاتی ہے؟ اس حوالے سے آج کے فیمنسٹ دو بڑے حصوں میں تقسیم ہیں۔ ایک حلقے کا خیال ہے جنسی / صنفی تقسیم قدرتی نہیں بلکہ ایک سماجی عمل ہے۔ معاشرے میں رائج دیرینہ تصورات اور رسومات انسانوں میں تذکیر و تانیت کا فرق پیدا کر دیتے ہیں۔ سیاست اور طاقت سے وابستگی اس تفریق کو تحفظ فراہم کرتی ہے اور یوں عدم مساوات پر مبنی ایک تفریق معاشرے میں جگہ بنا لیتی ہے۔

اسی طرح جبر اور احساس جبر، مساوات اور عدم مساوات، محنت اور اس کی قدر و قیمت، عزت، انصاف آزادی اور اس نوعیت کی دیگر کئی اصطلاحات ہیں جو بے انتہا وسیع مفہوم کی حامل ہیں اور ان کے تعین میں اختلافات سامنے آنا ایک لازمی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظریاتی اعتبار سے فیمنزم کی بے شمار ذیلی شاخیں وجود میں آ چکی ہیں۔ یہ سب شاخیں ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ضروری نہیں کہ آپس میں متصادم بھی ہوں ذیل میں چند اہم شاخوں کا تعارف درج کیا جا رہا ہے۔

Scanned by CamScanner

لبرل یا آزاد خیال فیمنزم:

لبرل فیمنزم کے حامی افراد کا خیال ہے کہ فیمنزم کا نظریہ تنگ نظری سے نہیں آزاد خیالی کی مدد سے کامیاب ہوسکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تحریک کا رخ مردوں کے خلاف نہیں بلکہ مردوں کے ساتھ عورتوں کی یکجہتی کی طرف ہونا چاہیے۔ یہ افراد معاشرے میں بتدریج تبدیلی کے خواہاں ہیں جو مرد اور عورت کے باہمی تعاون سے ہی رونما ہوسکتی ہے۔ لہٰذا لبرل فیمنسٹ معاشرے میں انقلابی اقدامات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ معاشرے کے موجودہ ڈھانچے میں رہتے ہوئے بھی مطلوبہ نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ [۲۴]

انارکسٹ فیمنزم:

لبرل فیمنسٹ کے مقابلے میں انارکسٹ فیمنسٹ ایک عملی بغاوت کی حمایت کرتے ہیں۔ انارکسٹ فیمنزم کے حامی افراد کا خیال ہے کہ طاقت کے خلاف عملی جدوجہد ہی مسائل کا حل ہے اور فیمنزم کے معاملے میں یہ جدوجہد یقیناً موجودہ پدرسری معاشرے کے خلاف عمل میں آئے گی۔ [۲۵]

مارکسی فیمنزم:

مارکسی فیمنزم یا سوشلسٹ فیمنسٹ عورت کے استحصال اور احساس جبر کا رشتہ مارکسی نظریات سے جوڑتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عورت کی محکومی کا مسئلہ دراصل ایک وسیع تر اقتصادی مسئلے کا حصہ ہے۔ پیداواری ذرائع کی غیر منصفانہ تقسیم معاشرے کو طبقات میں تقسیم کردیتی ہے۔ یہ طبقاتی نظام معاشرے میں تقسیم در تقسیم کرتا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام ختم ہوجانے

Scanned by CamScanner

کی صورت میں طبقاتی نظام دم توڑ دے گا اور اس کے ساتھ ہی عورت اور مرد جیسے امتیازات بھی ختم ہو جائیں گے [۲۶]۔

چونکہ مارکس اور اینگلز کے نظریات کے مطابق طبقاتی نظام کا خاتمہ۔ جنسی امتیاز کا خود بخود خاتمہ کر دے گا اس لئے بعض مارکسی دانشور فیمنزم کی حمایت کرنے کے بجائے اس کے مخالفت بھی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اصل جدوجہد بورژوا طبقے کے خلاف ہونی چاہیے جبکہ بعض مارکسی دانشوروں کا خیال ہے کہ نسائیت یا فیمنزم کو اگر صحیح معنوں میں کہیں دیکھا جا سکتا ہے تو مارکس اور اینگل کی تحریر میں۔

ریڈیکل فیمنزم:

مارکسی فیمنسٹوں کے برخلاف ریڈیکل فیمنسٹ یہ سمجھتے ہیں کہ عورتوں کے محکومی کا مسئلہ، طبقاتی نظام یا سرمایہ دارانہ نظام کے تابع نہیں بلکہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ ریڈیکل فیمنسٹ خیال کرتے ہیں کہ پدرسری معاشرہ ہی دراصل عدم مساوات کا ذمہ دار ہے۔ جب تک معاشرے میں بنیادی تبدیلیاں نہیں لائی جاتیں اور موجود معاشرتی ڈھانچے کو مسمار کر کے سوسائٹی کی تعمیر نو نہیں کی جاتی اس وقت تک مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔ ریڈیکل فیمنسٹ بعض اوقات تہذیبی فیمنزم یا کلچرل فیمنزم کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں [۲۷] کیونکہ ان کا لائحہ عمل سیاسی نہیں ہے، وہ تہذیب میں بنیادی تبدیلیوں کے خواہاں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تذکیر و تانیت کا فرق حیاتیاتی بنیادوں پر قائم نہیں ہے اور نہ ہی اسکا بدونی ساخت سے کوئی تعلق ہے۔ یہ تفریق سراسر تہذیبی بنیادوں پر کی گئی ہے اور اس لیے تہذیب کے ڈھانچے میں تبدیلی ناگزیر ہے۔

ریڈیکل فیمنسٹوں میں ہی ایک گروپ علیحدگی پسندوں Seperatist کے طور پر سامنے آیا [۲۸] اس گروپ کا خیال ہے کہ مرد کبھی بھی فیمنزم کی تحریک کا حصہ نہیں بن سکتے۔ ان کا

Scanned by CamScanner

خیال ہے کہ نیک نیتی سے فیمنزم کی حمایت کرنے والے مرد بھی لاشعوری طور پر پدرسری معاشرے کے تحفظ کا کام ہی سرانجام دے رہے ہیں لہذا عورت کو ارادتاً مرد سے قطع تعلق کر کے اپنی دنیا کے اصول خود طے کرنا ہوں گے۔

مشرقی فیمنزم:

مشرقی فیمنزم، فیمنزم کی وہ شاخ ہے جس نے مشرقی ممالک خصوصاً ان خطوں میں جو مغربی ممالک کے تسلط میں رہے، پرورش پائی۔ مشرقی فیمنسٹوں کا کہنا ہے کہ مشرقی ملکوں میں مغرب کا تسلط، ان کی لسانی، نسلی اور طبقاتی منافرتوں پر مبنی پالیسیاں ان خطوں میں عورت کی بدحالی کی ذمہ دار رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مغرب آج بھی اپنا معیار اور اپنا نظام فکر مشرقی ممالک بالخصوص تیسری دنیا کے ملکوں پر تھوپنا چاہتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ضروری نہیں کہ عورت مغربی تہذیب اپنانے کے بعد ہی روشن خیال، تعلیم یافتہ اور آزاد تصور کی جائے، اس کے برعکس ایک عورت اپنی تہذیبی اقدار کے اندر رہتے ہوئے بھی محکومی سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ یہ مشرقی فیمنسٹ لبرل اور ریڈیکل فیمنزم کی بعض صورتوں پر سخت تنقید کرتے رہے ہیں۔ مشرقی فیمنسٹوں کو یہ شکایت ہے کہ مغربی فیمنسٹ اپنے تجربات کو کلیت سمجھ کر ساری دنیا پر اپنے نظریات لاگو کر دینا چاہتے ہیں حالانکہ مغرب اور مشرق کی عورت اور اسکے مسائل و افکار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مشرق اور مغرب کے تصورِ عدل، جبر، مساوات اور خاندان میں بھی فرق ہے۔ مشرقی فیمنسٹوں کا خیال ہے کہ مغرب ابھی تک Colonial سوچ سے نجات حاصل نہیں کر سکا اور اسی لیے وہ فیمنزم میں بھی Overgeneralise کرتا نظر آتا ہے۔ یوں مشرقی فیمنسٹ عورتوں کی محکومی کے ساتھ مغربی استعماریت کے خلاف بھی آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں۔[۲۹]

یہ تو فیمنزم کی شاخوں کا ذکر تھا۔ بحیثیت ایک دبستانِ فکر فیمنزم نے ہر شعبہ زندگی کو متاثر

Scanned by CamScanner

کیا ہے۔ بشریات، سماجیات، معاشیات ہر مضمون میں نسائیت کے فکر اور فلسفے کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں چند مثالیں دیکھیے۔

جدید علوم وفنون اور نسائیت کا دبستان

نسائیت اور نفسیات:

نسائیت اور نفسیات کا رشتہ اوّل دن سے ہی قائم ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ فیمنسٹوں کا ایک حلقہ تذکیر و تانیث کی بنیاد بدونی ساخت یا حیاتیاتی فرق کو نہیں قرار دیتا بلکہ وہ اسے نفسیاتی Conditioning سمجھتا ہے اور اس لیے مسئلہ کا حل بھی نفسیات کے ذریعہ تلاش کرتا ہے۔[۳۰]

نسائیت اور تاریخ:

ایک نسائی مورخ پر دو فرائض عائد ہوتے ہیں اول تو یہ کہ وہ تاریخ کی نسائی نقطۂ نظر سے از سر نو تفہیم کرے دوم یہ کہ وہ تاریخ کے کونے کھدروں سے عورتوں کے نام تلاش کر کے اور انہیں درست مقام دلانے کی کوشش کرے۔

یہ عام تجربے کی بات ہے کہ ہمارے مورخ بڑی آسانی کے ساتھ عورتوں کے نام خدف کر جاتے ہیں۔ آخر ہماری تاریخوں میں عورتوں کے نام نظر کیوں نہیں آتے؟ میر تقی میر نے نکات الشعرا لکھتے ہوئے اپنی ہی گھر میں موجود شاعرہ کو نظر انداز کیوں کر دیا؟ نسائی مورخ ایسی

Scanned by CamScanner

خواتین کا کھوج لگاتے ہیں جنہیں مورخین نے محض اس لئے نظر انداز کر دیا کہ وہ عورتیں ہیں اور پھر یہ مورخ ان کی اہمیت اور مقام کا تعین بھی کرتے ہیں۔[۳۱]

نسائیت اور مذہب:

مذہبی نسائی مکتبہ فکر مذہبی رسومات، آثار اور روایات کا مطالعہ نسائی نقطہ نظر سے کرتا ہے۔ ایک طرف یہ دبستان مذہبی معاملات میں عورتوں کے کردار پر بحث کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مذہبی معاملات میں عورت کا دخل بہت کم ہے مذہبی رہنمائی کے لیے خواتین نہ ہونے کے برابر ہیں ان کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے۔ دوسری طرف ان کا خیال ہے کہ مذہب کی تشریح اور تفسیر پر بھی پدرسری سوچ حاوی ہے لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مقدس تحریروں کی ازسرنو تفہیم وتشریح کی جائے۔ ایسی تفہیم وتشریح جس کے پیچھے پدرسری معاشرے کی سیاست کا عمل دخل کم سے کم ہو۔ مذہبی فمنسٹ کا خیال ہے کہ مذہبی تحریروں کی درست تشریح کی جائے تو اس کے ذریعے مساوات پر قائم معاشرے کا حصول ممکن ہے۔[۳۲]

نسائیت اور معاشیات:

علم معاشیات کے ساتھ بھی فیمنزم کا پرانا رشتہ ہے عورتوں کی خودمختاری کا مسئلہ اٹھا تو محنت اور ملازمت کے مسائل بھی زیر بحث آئے۔ بعض افراد کا خیال ہے کہ عورت کی محکومی کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ جسمانی مشقت میں مرد کی برابری نہیں کر سکتی لہذا لیبر مارکیٹ میں مرد کی محکوم بن جاتی ہے اور بلآخر معاشرے میں بھی محکوم ہو جاتی ہے[۳۳] یہاں نسائی ماہرین معاشیات جسمانی مشقت کے معیار اور پیمائش کا سوال اٹھاتے ہیں تو ساتھ ہی گھریلوں کاموں کی قدر و قیمت کا مسئلہ بھی کھڑا ہوتا ہے۔ نسائی اکنامسٹ گھریلو کام کاج، بچوں کی تربیت اور ضعیفوں کی

Scanned by CamScanner

خدمت جیسے کام جو عورت بلا معاوضہ کرتی ہے انکی درست قدر و قیمت ادا کرنے پر زور دیتے ہیں۔

نسائیت اور قانون:

قانون کا نسائی دبستانِ فکر قانون اور جنس (Gender) کے باہمی تعلق کا مطالعہ کرتا ہے۔ نسائی ماہر قانون ایسے قوانین کی تبدیلی کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ جو خواتین کے مفادات میں نہ ہوں۔ ان کا مقصد ایسے قوانین کی اصلاح یا ترمیم یا تنسیخ ہے جو پدرسری معاشرے کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔

نسائیت اور سیاست:

نسائی سیاست کا تذکرہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے ظاہر ہے کہ فیمنزم کی تحریک کا عملی رخ بڑی حد تک سیاسی رہا ہے۔ قوانین میں ترمیم، ووٹ کا حق اور دیگر مسائل کے حل کے لیے فیمنسٹ عملی سیاست میں قدم رکھتے رہے ہیں۔ پدرسری معاشرے کے قیام اور عورتوں کی محکومی کی وجوہات بھی کسی نہ کسی اعتبار سے ایک سیاسی عمل کا حصہ ہیں۔ اس لیے سیاسی آگہی اور عورتوں میں سیاسی شعور کی بیداری بھی فیمنسٹوں کی اہم ذمہ داری رہی ہے۔ یہی نہیں، سیاسی معاملات کی نسائی نقطہ نظر سے جانچ اور پرکھ بھی نسائی دبستانِ سیاست کا حصہ ہے۔

نسائیت اور فلسفہ:

نسائی فلاسفر ایک طرف فلسفیانہ نظریات کو نسائیت تحریک مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں تو دوسری طرف نسائی نقطہ نظر سے مروجہ فلسفوں کو بھی پرکھتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

نسائیت اور میڈیا:

نسائی تحریک اس امر سے بھی خصوصی تعلق رکھتی ہے کہ میڈیا عورت کا کیا تصور سماج کے سامنے پیش کرتا ہے۔ نسائی دبستان سے تعلق رکھنے والے فلمی نقاد اکثر شکایت کرتے ہیں کہ فلم اور ٹی وی پر عورت کو ایک تفریح بنا کر پیش کیا جاتا ہے عموماً عورتوں کے کردار پدرسری معاشرے کے تصور کو تحفظ دیتے نظر آتے ہیں۔ وہ پردے پر ہیرو کی اور نتیجۃً ناظرین مردوں کی دلبستگی کا سامان بنادی گئی ہے۔ اس دبستان کا ایک فرض فلم اور ڈرامہ کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا بھی ہے۔ فیمنسٹ پروڈیوسر یا ہدایات کار نسائی موضوعات اور مسائل پر فلم بنا کر عوام کی رائے ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نسائیت اور ادب:

نسائیت اور ادب کا تعلق بھی روز اوّل سے قائم ہے۔ نسائی تحریک کی ابتدا اور فروغ میں سب سے پیش پیش ادیب خواتین رہیں۔ اس لیے ادب کے نسائی دبستان فکر میں نسائی تحریک کے مقاصد واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو ابتدا سے ہی نسائیت کی تحریک میں سائمن ڈی بوا اور ورجینا وولف جیسی ادیب خواتین موجود رہیں۔ نسائی ادیب تخلیق اور تنقید دونوں میدانوں میں نسائیت Feminism کا اظہار کرسکتا ہے یعنی فیمنسٹ کی تخلیق میں بھی فیمنسٹ رویہ کا اظہار ہوسکتا ہے اور وہ ادب کا مطالعہ بھی نسائی نقطہ نظر سے کرسکتا ہے جسے نسائی تنقید کا نام دیا جاتا ہے اور جس پر تفصیلی گفتگو آئندہ صفحات میں کی جائے گی۔

یہ چیدہ چیدہ شعبہ جات کا تذکرہ تھا۔ عالمگیریت کے اس عہد میں دنیا کے تمام علوم و فنون ایک دوسرے کو Overlap کررہے ہیں۔ نتیجتاً نسائیت یا فیمنزم نے بھی دوسرے مکتبہ

Scanned by CamScanner

ہائے فکر اور مطالعاتی شعبہ جات سے تعلق قائم کرلیا ہے دیگر علوم ونظریات نسائی مکتبہ فکر پر اثر انداز بھی ہورہے ہیں اور اس سے اثر پذیر بھی نظر آتے ہیں۔مثلاً Gender Studies, Women Studies اور Queer Studies نے ایک علیحدہ سماجی علم کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔[۳۴]

اینٹی فیمنزم:

دوررس اثرات کی حامل تحریک کا ردعمل بھی ضرور ہوتا ہے اور اسے مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔

فیمنزم کا بھی ردعمل سامنے آیا جسے فیمنسٹ عموماً اینٹی فیمنزم کا نام دیتے ہیں۔[۳۵] اینٹی فیمنزم (Antifeminsim) تحریک سے وابستہ افراد کا خیال ہے کہ فیمنزم نے اپنے مقاصد حاصل کرلیے ہیں اور اب اس کا مقصد مرد پر عورتوں کی برتری قائم کرنا ہے۔اینٹی فیمنسٹ کی تنقید کا نشانہ عموماً وہ مسائل بنتے ہیں جن میں عورت کے لیے مراعات کا مطالبہ ہوتا ہے۔یا پھر وہ قوانین جن کا جھکاو مرد کی نسبت عورت کی طرف زیادہ ہوتا ہے مثلاً بچے کی تحویل کا مسئلہ،تولید سے متعلق مسائل،طلاق اور جائیداد وغیرہ کے مسائل۔

اینٹی فیمنسٹوں کا خیال ہے کہ طلاق کے بڑھتے ہوئے رجحان کی ذمہ دار فیمنزم/یا نسائی تحریک ہے۔ان کا خیال ہے کہ فیمنزم نے عورت کو گھر کے محفوظ اور پرسکون ماحول سے نکال کر ایک لاحاصل مسابقت کی دوڑ میں لگادیا ہے۔اینٹی فیمنسٹوں کا خیال ہے کہ عورت،مرد کی برابری کرنے کے شوق میں بے انتہا مشقت کرتی ہے جس کی اسے چنداں ضرورت نہیں۔انکا یہ بھی کہنا ہے کہ بعض شعبہ ہائے زندگی ایسے ہیں جن میں عورتوں کی شمولیت،شعبے کی کارکردگی پر خراب اثرات مرتب کرے گی،مثلاً فوج میں عورتوں کی شمولیت،فوج کی صلاحیت کو کمزور کردے گی۔

Scanned by CamScanner

فیمنزم کی مخالفت عموماً، طلاق، ابارشن، شادی، تولید، جنسی تعلقات اور مرد بیزاری جیسے مسائل پر دیکھنے میں آئی اس کے مقابلے صنفی امتیازات، تشدد، Sexual Harassment، استحصال، ملازمت اور تعلیم کے یکساں مواقع اور بہتر ماحول، جیسے مسائل پر فیمنزم کو ان حلقوں سے بھی مدد ملی جو اپنے آپ کو فیمنسٹ نہیں کہلاتے یا جو دیگر معاملات پر غیر جانبدار رہتے ہیں۔ آج دنیا بھر میں عورتوں کی لیڈرشپ اور علمی و فنی میدانوں میں عورتوں کی برتری نے دانشوروں، طالب علموں اور اساتذہ کو ایک بار پھر نسائیت کی تحریک کے مطالعے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس صورت حال میں جنوبی ایشیاء کی نسائی تحریک ایک جداگانہ اہمیت اور حیثیت رکھتی ہے۔

IHSAN UL HAQ (BS-URDU)

Scanned by CamScanner

باب اوّل

حواشی و حوالہ جات

[۱])Britannica Concise Encyelopedia http:// www . britannica.com/feminism Retrieved on 27/11/2008

[۲] انگریزی عبارت اس طرح ہے:

"Feminism is the theory of political ,economics and social equality of sexes".

Merrium -Webster Online Dictionary (2008)
http://www.merrium.webster.com/dictonary/feminism
Retrieved on 27/11/ 2008

[۳]انگریزی عبارت یوں ہے:

"Feminism is both an intellectual commitment and a political movement thet seeks justice for women and the end of sexism in all forms"

Stanford Encyclopedia of Philosophy http://plato .stanford.edu/cgi-bin/encyclopedia/orchinfo.cgi
Retrieved on 15/07/2010

[۴]Collins Dictionary and Thesaurus. (2006),Collins,London 'Feminism is the belief in the importance of gender equality, (5) invalidating the idea of gender hierarchy as a socially constructed concept." By Nancy Cott (1987), The Grounding of Modern Feminism, Yale University Press. p-4-5

[۱]Cornell Durcilla (1998), At the Heart of Freedom; Feminism, Sex and Equality, Princeton University Press,

Scanned by CamScanner

Princeton, NJ. P.5

[۷]Walby, S. (2000), Feminist Theory, Rouledge,London p.236

[۸] Weedon, C (1999), Feminism, Theory and the Politics of Difference. Blackwell, Oxford p.32

[۹]Nancy Cott (1987), The Grounding of Modern Feminism, Yale University press

[۱۰] Nancy Cott (1987), The Grounding of Modern Feminism, Yale University press

[۱۱]ایضاً

[۱۲]عورتوں کی محکومیت (۱۹۹۳) ترجمہ افتخار شیروانی مطبوعہ فیروز سنز۔ لاہور

[۱۳]Nancy Cott (1987) The Grounding of Modern Feminism Yale University Press

[۱۴]Davidoff (1986), Our Work, Our Lives, Our Words: Women's History, Women's Work. MacMillan, London

[۱۵]Simone de Beauvoir. 1974 (1952). The Second Sex, Translated and edited by Parshley. Vintage Books, New York

[۱۶]Elanie Showalter, (1988) Towards a Feminist Poetics: The New Feminist Criticism Random House, New York

[۱۷]Betty Friedan, (1963) The Feminine Mystique, Norton, NewYork

[۱۸]ایضاً

[۱۹]Elanie Showalter (1988), The New Feminist Criticism, Random House, New York

[۲۰]ایضاً

[۲۱]ایضاً

Scanned by CamScanner

[۲۲]ایضاً

[۲۳]ایضاً

[۲۴]Cathrine Mackinnon (1989) "Towards a Feminist Theory of the State", Havard University Press, Chicago

[۲۵]ایضاً

[۲۶] Friedrich Engels, 1972 (1845) "The origin of The Family, Private Property and the State, International Publishers, New York.

[۲۷]Cathrine Mackinnon (1989) "Towards a Feminist Theory of the State", Havard University Press, Chicago.

[۲۸]ایضاً

[۲۹] S. Mills (1998), "Post Colonial Feminist Theory"in "Contemporary Feminist Theories" edited by Jackson and Jones, Edinburgh University press, Edin burgh, p.9۲-112

[۳۰] Barbara Johnson (2002) The Feminist Difference: Literature, Psychoanalysis, Race and Gender. Havard University Press, Chicago

[۳۱]Cathrine MacKinnon, Towards a Feminist Theory of the State, Havard University Press, Chicago

[۳۲]ایضاً

[۳۳]ایضاً

[۳۴]ایضاً

[۳۵]ایضاً

Scanned by CamScanner

باب دوم

جنوبی ایشیا (پاک و ہند) میں نسائیت/فیمینزم کی تحریک اور اردو ادب

- تاریخی پس منظر
- تعلیم نسواں کی تحریک
- اصلاحی نسائیت
- تحریک آزادی کی نسائی آوازیں
- ترقی پسند نسائیت
- دیگر ادبی رجحانات اور تحاریک
- حواشی و حوالہ جات

Scanned by CamScanner

جنوبی ایشیا (پاک و ہند) میں نسائیت/فیمنزم کی تحریک اور اردو ادب

تاریخی پس منظر

جنوبی ایشیا کی نسائی تحریک، مغرب کی نسائی تحریک سے ایک اعتبار سے متصل ضرور ہے لیکن اپنے آپ میں ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مغرب سے جڑی ہوئی اس اعتبار سے ہے کہ مغرب کی فیمنسٹ تحریک کا اثر جنوبی ایشیا تک پہنچا۔ یورپ میں عورتوں نے ایک طویل جدوجہد کے بعد ووٹ کا حق حاصل کیا تو جنوبی ایشیا کی عورت کو ووٹ کا حق ملنے کا راستہ بھی صاف ہو گیا۔ یورپ میں عورت کو تعلیم، ملازمت، جائداد میں حصے کا حق ملا تو جنوبی ایشیا میں بھی اس معاملے میں آئین و قانون کی تشکیل کی راہ ہموار ہوئی۔ ان سب باتوں کے باوجود جنوبی ایشیا میں عورت کی جو وابستگی خاندانی سسٹم اور سماجی نظام کے ساتھ ہے کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئی۔ سماجی ڈھانچے social structure کو جڑ سے اکھاڑ دینے یا پورا نظام از سر نو ترتیب دینے کے لئے جس نوعیت کے مطالبے مغرب میں ہوئے جنوبی ایشیا، پاک و ہند میں دیکھنے میں نہیں آئے۔ اس کے ساتھ تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ اس خطے میں معاشرہ اندرونی طور پر جن تضادات کا شکار ہے یورپ کا معاشرہ ان سے آزاد ہے۔ مذہب، زبان، نسل، ذات پات، دولت، سیاست جیسی بے شمار چیزیں ہیں جو اس خطے کی سوسائٹی کو تقسیم در تقسیم کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس صورتحال میں مرد اور عورت کی تقسیم اصل مسئلے کا محض ایک چھوٹا سا جزو معلوم ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے اس خطے کے فیمنسٹ نظریات میں وہ تندی اور تیزی نظر نہیں آتی جو مغرب میں نظر آتی ہے۔

ان سب حقائق کے ساتھ جو چیزیں اس خطے کی نسائیت کو ممتاز و منفرد بناتی ہیں وہ

Scanned by CamScanner

عورت اور سوسائٹی کا تعلق ہے۔ جنوبی ایشیا کی تاریخ میں عورت کو جو اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ کہا جاتا ہے کہ

''قدیم ہند میں ہزاروں برس مادر سری نظام رائج رہا بلکہ بعض مورخین کے مطابق کے دنیا کے بہت سے ملکوں میں مادری نظام ہندوستان سے گیا۔''[۱]

آریوں کی آمد سے پہلے اس مادر سری نظام میں دھرتی کو ماں کا درجہ حاصل تھا۔ ''پراکرتی'' یعنی، فطرت دنیا کو تخلیق کرنے والی مقدس دیوی تھی۔ اہم فیصلے عورت کے ہاتھ میں تھے۔ تخلیقی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے وہ دیوی تھی اور حاکم بھی۔

بقول سبطِ حسن

''ان کے نزدیک عورت کی ذات تخلیق کی سرچشمہ تھی۔ وہ پوری کائنات کو انسانی جسم کے حوالے سے دیکھتے تھے۔ یعنی جس طرح عورت مرد کے ملاپ سے نیا انسان پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسری چیزیں بھی وجود میں آتی ہیں۔ البتہ اس تخلیقی عمل میں عورت کا کردار مرد سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ تنترک اور سانکھیہ فلسفیوں کی بنیاد بھی اسی عقیدے پر ہے''[۲]

عرصے تک اس خطے کے اہم فیصلے عورت کے ہاتھ میں رہے۔ تہذیب وتمدن عورت کے ہاتھ میں پروان چڑھتے رہے لیکن آریوں کی آمد کے بعد صورتِ حال تبدیل ہوگئی۔

''آریوں کے بڑے دیوتا سب مرد تھے۔ دیویاں خال خال ہوتی تھیں، اور وہ بھی دیوتاؤں کی بیویاں نہ تھیں بلکہ داشتائیں تھیں۔ آریہ مادر ارض کی پرستش نہ کرتے تھے اور نہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کے معتقد تھے کیونکہ ان کے معاشرے میں عورت کا مقام نہایت

Scanned by CamScanner

پست تھا۔ان کے مذہب میں فعال قوت مرد کی تھی''۔[۳]

آریہ مقامی لوگوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ترب وضرب کے ماہر بھی تھے۔آریوں کی آمد کے بعد پیداواری ذرائع میں انقلاب آ گیا۔انہوں نے زمین کی جتائی کے لیے ہل بیل کا استعمال شروع کیا۔وہ لوہا بنانا بھی جانتے تھے ان کے بالوں میں لوہے یا کانسی کے پھل لگے ہوئے تھے۔اس کی وجہ سے زرعی پیداوار میں بہت اضافہ ہو گیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ دھرتی سے زیادہ ہل بیل نے اہمیت اختیار کر لی۔مادری نظام تہ و بالا ہو گیا''برہما''تخلیق کا دیوتا،تری مورتی میں تو شامل رہا مگر اس کی علیحدہ پوجا ممنوع قرار دے دی گئی۔اس کے مقابلے میں''وشنو''اور''شیوا''،تحفظ اور قوت کے دیوتا پہلے سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گئے اور اس خطے میں پدرسری معاشرہ قائم ہو گیا۔

اس پدرسری معاشرہ میں عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازات کی انتہائی صورتیں نظر آئیں۔مثال کے طور معاشرے میں''ستی''جیسی رسومات کا رواج ہوا۔ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں کہ

> ''ستی کی پہلی یادگار مدھیا پردیش کے شہر اران میں ملتی ہے۔ستی کے رسم کے پس منظر میں عورت کی سماجی حیثیت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ آہستہ آہستہ اس کی اپنی ذات اور اس کی شناخت ختم ہوتی جاتی ہے اور وہ مکمل طور پر مرد کی ملکیت ہو جاتی ہے۔اس لئے شوہر کی وفات کے بعد اس کے لئے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔''[۴]

ممکن ہے کہ عورت کی سماجی اور انفرادی حیثیت کو ختم کر دینے کی یہ کوشش مرد طبقے کی جانب سے ایک نوع کا ردِعمل یا انتقام ہو۔کیونکہ مورخین لکھتے ہیں کہ مادرسری معاشرے میں مردوں کے استحصال اور نسوانی استبداد کی بے شمار صورتیں موجود تھیں۔قربانی کے قانون کی ایک مثال ڈاکٹر مہر عبدالحق اپنی کتاب''ہندو صنمیات''میں اس طرح درج کرتے ہیں کہ

Scanned by CamScanner

''حکم یہ ہے کہ شہزادے، مملکت کے وزراء، کونسلر اور شراب بیچنے
والے آسودہ حالی اور دولت حاصل کرنے کے لئے دیوی کے سامنے
قربانی پیش کریں اور دیوی کو جو شکار پیش کیا جاوے اگر انسان ہو تو
پچیس سال کا ہو''۔[۵]

یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس معاشرے میں عورت کی قربانی قطعاً ممنوع تھی اس دور میں اس طرح کے بے شمار قوانین موجود تھے جو مردوں کا سماجی مرتبہ اور اختیار ختم کر دیتے تھے۔ اور اس کی انفرادی شخصیت کو بھی تقریباً مٹا کر رکھ دیتے تھے۔

ڈاکٹر مہر الحق لکھتے ہیں کہ

''اگر چہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے لیکن آج بھی بعض پجاری دیوی کو
خوش کرنے کی غرض سے اپنا جسم کاٹ ڈالتے ہیں یا جلا لیتے ہیں، یہ
اسی نظام کی نشانی ہے۔ اسی صورت حال کا ردِ عمل تھا کہ جب مرد راج
ہوا تو کم سن لڑکیوں کی شادی۔ کنواریوں کی قربانی اور ستی جیسی
رسومات پروان چڑھیں''۔[۶]

یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا عورت کی یہی دو انتہائی صورتیں اس خطے میں موجود تھیں؟ یعنی ایک انتہائی ظالم اور دوسری انتہائی مظلوم۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت کی اصل صورت ان دونوں انتہاؤں کے درمیان کہیں موجود ہے۔ اس عورت کی ایک بہت اچھی مثال ''سیتا'' کے کردار کی صورت میں ملتی ہے۔ ''سیتا'' اور ''رام'' کی کہانی میں اس خطے کی عورت کی کہانی پوشیدہ ہے۔ سیتا جنوبی ایشیا کی عام عورت ہے جسے دیوی ہو کر بھی اگنی پرکشا سے گزرنا پڑا۔

ترک اور مغل اس خطے میں آئے تو جو تہذیب ساتھ لائے تھے اس میں عورت کی حالت بہت بہتر تھی۔ ابتدائی تعلیم کے لئے لڑکیوں کو مکتب جانے کی اجازت تھی۔ اس کے بعد گھر میں ان کی تعلیم کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ اس حوالے سے بھی کئی افراد نے تحقیق کی ہے۔ عابدہ سمیع

Scanned by CamScanner

الدین نے ایک مفصل کتاب مرتب کی ہے جس کا عنوان ہے۔

Feminism And Feminist Movement In Central Asia

۲۰۰۳ء میں شائع ہونے والی یہ کتاب ۴۱۲ صفات پر مشتمل ہے۔[۷] اس کتاب میں انہوں نے اسلام میں نسائیت (Feminism) کے تصور پر بات کی ہے اور وسط ایشیا یعنی افغانستان، آذربائیجان، قازقستان، تاجکستان اور ازبکستان کے مسلم معاشرے کی خواتین کی حالت کا جائزہ لیا ہے۔

اس کتاب کے علاوہ فہمیدہ ریاض کے وہ لیکچر جو انہوں نے ۱۹۹۳ء میں برطانیہ میں اسی موضوع پر دیے۔ فہمیدہ ریاض کا بھی یہی کہنا ہے کہ فیمنزم مسلم گھرانوں کے ورثے کا اہم حصہ ہے۔[۸]

اس طرح نگہت سعید کی مرتب کردہ کتاب Unveiling the Issues اور اثر (ASR) گروپ[۹] کی طرف سے شائع ہونے والے کتابوں میں بھی کئی جگہ اس بات کو موضوع بنایا گیا ہے کہ اسلامی معاشروں میں نسائیت کے رجحانات کی نوعیت کیا رہی ہے۔ خصوصاً وسط ایشیا سے ہندوستان آنے والے مسلم گھرانوں میں عورتوں کا مقام و مرتبہ کیا تھا۔ اس بات پر سب ہی اتفاق کرتے نظر آتے ہیں کہ وسط ایشیا سے ہندوستان آنے والے مسلم گھرانوں میں عورتوں کی تعلیم اور تربیت کی بڑی صحت مندانہ روایات موجود تھیں۔ ان سے اہم اور غیر اہم فیصلوں میں مشاورت کی جاتی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان مسلم گھرانوں میں عورتوں سے متعلق اقدار اس وقت کے یورپ سے بھی بہتر تھیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ سامراجی قوتیں، پدرسری معاشرے کے ساتھ مل کر ان صحت مند مثبت اقدار کو مٹاتی چلی گئیں۔ شعوری یا لاشعوری طور پر عورت کی ہر اس کوشش کو دبایا جاتا رہا جس کے ذریعے وہ اپنی کھوئی ہوئی شان و شوکت حاصل کر سکتی تھی۔ ایسے جبر کے باوجود تہذیب کی بنیادوں میں موجود نسائیت کسی نہ کسی طرح اپنا اظہار کرتی رہی۔ اردو ادب کے ابتدائی عہد میں عورت کو شعر و ادب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ اسے شعر کہنے کی اجازت نہیں تھی لیکن

Scanned by CamScanner

جذبے کی سچائی اور گہرائی کے اظہار کے لئے شاعر نسائی زبان اختیار کرنے پر مجبور تھا۔ فضل کی بکٹ کہانی ہو یا حضرت امیر خسرو کے گیت۔ نسائیت میں گندھی تہذیب ابتدائی اردو شاعری میں صاف نظر آتی ہے۔ امیر خسرو کی غزل کا صرف ایک شعر دیکھئے۔

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف وروز وصلش چوں عمر کوتاہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یا پھر وہ مشہور دوہا دیکھئے جو امیر خسرو نے حضرت نظام الدین اولیا کی وفات پر کہا کہ۔

گوری سووے سیج پر مکھ پہ ڈارے کیس

چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھی چودیس

یہ، اور ایسے بے شمار اشعار پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کے عشق و معرفت اور کام و دھرم کے تمام فلسفے اور تمام سلسلے اسی ایک فکر اور اس ایک حسیٹ سے جڑے ہوئے تھے جسے نسائیت کہتے ہیں۔ شاہد و مشہور، مراد و مرید، حقیقت و مجاز سب سلسلے عورت، کے وجود سے ملتے نظر آتے ہیں۔ موضوع خارجی ہو یا داخلی، امیر خسرو کا لب ولہجہ ہو یا قلی قطب شاہ کا۔ عورت اور اس کی نسوانیت اردو شاعری کی بنیادوں میں موجود ہے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ رنگ معدوم ہو گیا۔ حسن و عشق، دونوں کے لئے تذکیر کا صیغہ استعمال ہونے لگا۔ عورت کا لب ولہجہ نظر آیا تو ریختی جیسی مبتذل صورت میں نثر کے حوالے سے دیکھئے تو وہاں بھی یہی صورت ہے۔ داستانوں کے کچھ نسوانی کردار ہیں جو مردوں کے قلم سے تخلیق کیے گئے ہیں۔ عورت کے اپنے احساسات و جذبات کی ترجمانی موجود نہیں ہے۔ میر تقی میر نکات الشعراء لکھتے ہیں تو اپنی ہی بیٹی کا نام اس میں شامل نہیں کرتے۔ گویا عورت تخلیق تو کر رہی تھی لیکن مورخ کو دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ مورخ کے ذہن سے عورتوں کے نام با آسانی فراموش ہو جایا کرتے تھے۔ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں عورتوں کے نام تذکروں میں نظر آنا شروع ہوئے۔ فصیح الدین رنج کا تذکرہ ''بہارستان ناز'' ۱۸۶۴ء[۱۰]، عبدالحی صفا کا تذکرہ ''شمیم سخن'' ۱۸۷۲ء[۱۱] اور درگا پرشاد نادر کا

Scanned by CamScanner

تذکرہ ''چمن انداز'' ۱۸۷۸ء[۱۲] میں شائع ہوا۔ یہ اولین تذکرے ہیں جن، میں خواتین کے نام نظر آتے ہیں۔ گویا اردو شعر و ادب کی چار سو سالہ تاریخ میں ہی عورتوں کا کوئی قابلِ ذکر مقام متعین نہیں کیا گیا تھا۔

تعلیمِ نسواں کی تحریک:

جنوبی ایشیا میں عورت کی تعلیم، خصوصاً مسلم گھرانوں میں عورتوں کی تعلیم کا جو رہا سہا رواج تھا وہ بھی انگریزوں کی اس خطے میں آمد کے بعد دم توڑ گیا۔ جہاں کمپنی کی شادی اور پردے کی بے جا سختیوں نے عورتوں کی تعلیم کے راستے اور مشکل کر دیے تھے وہیں ایک سبب یہ بھی تھا کہ مسلمان جدید تعلیم خصوصاً، عورتوں کی تعلیم سے خائف تھے جیسا کہ سر سید احمد خان نے اپنی مشہور کتاب ''اسباب بغاوتِ ہند میں تحریر کیا ہے کہ

> ''لوگ یقین جانتے ہیں کہ سرکاری تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکولوں میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں۔ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی بعض اضلاع میں اس کا نمونہ قائم ہو گیا تھا۔''[۱۳]

غرض یہ وہ حالات تھے جن کی وجہ سے جنوبی ایشیاء کی عورتیں خصوصاً مسلم گھرانوں کی عورتیں تعلیمی پس ماندگی کا شکار ہو گئیں۔ تنگ نظری اور رجعت پسندی ایسی عام تھی کہ عورت تو عورت مردوں نے جدید تعلیم کے دروازے اپنے اوپر بھی بند کر لئے تھے۔

اس صورت حال میں پہلی تبدیلی علیگڑھ تحریک کے زیرِ اثر نظر آئی۔ سر سید احمد خان کے صاحبزادے سید محمود جب لندن سے تعلیم حاصل کر کے واپس آئے تو انہوں نے مسلمان عورتوں کی

Scanned by CamScanner

تعلیم پر خاص توجہ دی۔ ہر چند کہ اس موقع پر خود سرسید احمد خان نے اس کی مخالفت کی تھی تاہم ۱۸۸۹ء کے بعد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ہر اجلاس میں عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ شد و مد سے اٹھایا گیا تھا[۱۴]۔ بالآخر ۱۸۹۹ء میں سید محمود اور جسٹس امیر علی کی کوششوں سے کانفرنس میں عورتوں کی تعلیم کی قرارداد منظور کر لی گئی۔ یوں سرسید تحریک کے زیرِ اثر پہلی مرتبہ عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ زور و شور سے زیرِ بحث آیا۔ سرسید احمد خان کی تمام تر توجہ مردوں کی تعلیم پر مرکوز ہونے کے باوجود سرسید کی تحریک سے ہی ایسے لوگ سامنے آئے جنہوں نے تعلیمِ نسواں کو باقاعدہ تحریک کی صورت دے دی۔

تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں جہاں سید محمود اور جسٹس امیر علی نے عملی کام کیے وہاں سرسید کے اپنے رفقاء نے ادب کا سہارا لے کر عورتوں کے مسائل پر توجہ مبذول کروائی اور بیداری کا پیغام دیا۔ نذیر اور حالی اس حوالے سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

نذیر احمد دہلوی اردو کے پہلے ناول نگار ہی نہیں عورتوں کی تعلیم کے لئے کام کرنے والے پہلے ادیب بھی ہیں۔ ان کے اوّلین ناول ''مراۃ العروس'' [۱۵] اور ''بنات النعش [۱۶]'' عورتوں کی تعلیم کی غرض سے ہی لکھے گئے۔ اسی عرصے میں سرشار اور شرر بھی ناول نگاری کے میدان میں آئے اور عورتوں کی تعلیم کو موضوع بنایا۔ سرشار کے ناول ''فسانہ آزاد'' [۱۷] میں عورتوں کی تعلیم کے بارے میں مثبت خیال نظر آتے ہیں۔ شرر نے اگرچہ تاریخی ناول لکھے لیکن ان کا ناول ''بدر النساء کی مصیبت'' [۱۸] عورتوں کی اصلاح اور پردے کی بے جا سختی پر لکھا گیا۔ حالی نے تعلیمِ نسواں کے موضوع پر کتاب ''مجالس النساء'' تحریر کی۔ ۱۸۷۰ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں حالی نے نظم ''چپ کی داد'' کے عنوان سے پڑھی اور اس میں عورتوں کی تعلیمی اور تہذیبی حالتِ زار کا نقشہ بڑی دردمندی کے ساتھ پیش کیا۔ [۱۹]

سرسید احمد خان کے بعض دوسرے ساتھیوں ذکا اللہ، مولوی چراغ علی، محسن الملک اور شبلی نے بھی تعلیمِ نسواں کی حمایت میں مضامین لکھے اور تقاریر کیں۔ اسی دوران علی گڑھ کے تعلیم

Scanned by CamScanner

یافتہ نوجوانوں نے تعلیمِ نسواں کے مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ شیخ عبداللہ اور سجاد حیدر یلدرم نے اس سلسلے میں عملی کوشش کی۔

شیخ عبداللہ نے مسلمان عورتوں کی تعلیم کے لئے بے حد فعال کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں ان کی اہلیہ نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ ۱۸۹۰ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ جو تعلیم نسواں کیلئے قائم کی گئی اس کے سیکریٹری شیخ عبداللہ ہی تھے۔ ۱۹۰۴ میں انہوں نے اہلیہ کے ساتھ مل کر رسالہ ''خاتون'' جاری کیا۔ ۱۹۰۴ء میں لڑکیوں کا ایک اسکول علی گڑھ میں اعلیٰ بی بیگم شیخ عبداللہ کی کوششوں سے قائم ہوا جو بعد میں ترقی کر کے کالج کے درجے تک پہنچا اور ۱۹۳۶ء میں یونیورسٹی سے ملحق ہوا۔ [۲۰]

سجاد حیدر یلدرم نے بھی تعلیم نسواں پر مضامین تحریر کیے۔ مولوی ممتاز علی کا نام بھی اس سلسلے میں اہم ہے۔ ان حالات میں ایسی خواتین بھی سامنے آئیں جنہوں نے تحریری اور عملی طور پر تعلیمِ نسواں کی تحریک میں حصہ لیا۔

ان خواتین میں سب سے اہم نام بھوپال کی سلطان جہاں بیگم کا ہے۔ سلطان جہاں بیگم بھوپال کی ملکہ نے اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ سلطان جہاں بیگم نے تین مدرسے قائم کیے تھے۔ ''مدرسہ وکٹوریہ'' ''مدرسہ بلقیسہ'' اور ''مدرسہ سلطانیہ''۔ اس کے علاوہ ایک کتب خانہ ''کتب خانہ حمیدیہ'' بھی قائم کیا۔ ۱۹۰۷ء میں سلطان جہاں بیگم نے ایک مدرسہ اپنی ریاست کی ہندو لڑکیوں کے لئے بھی قائم کیا۔ مدرسہ آصفیہ کا قیام بھی بیگم بھوپال مرہونِ منت ہے۔ جہاں ڈاکٹری اور طب یونانی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ [۲۱]

اس جگہ ان اردو رسائل و جرائد کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لئے جاری کیے گئے۔ ۱۸۸۴ء میں محب حسن نے دکن سے ''معلم'' رسالہ جاری کیا۔ [۲۲] ۱۸۹۸ء میں ممتاز علی کا مشہور رسالہ ''تہذیبِ نسواں'' جاری ہوا۔ [۲۳] ۱۹۰۴ء میں شیخ عبداللہ نے علیگڑھ سے ''خاتون'' رسالہ نکالا [۲۴] اور ۱۹۰۸ء میں علامہ راشد الخیری نے ''عصمت'' دہلی

Scanned by CamScanner

سے جاری کیا۔[۲۵] ۱۹۰۹ء میں رسالہ شریف بی بی" لاہور سے اور اسی سال "الحجاب" بھوپال سے جاری ہوا۔[۲۶] ان سب رسائل کا بنیادی مقصد تعلیم نسواں کا فروغ تھا اور ان میں سے بعض کی ادارت بھی خواتین کے ذمہ تھی اس پورے عرصے میں انگریز مشنری اسکول تو کام کر ہی رہے تھے۔ان اسکولوں کے مقابلے میں ہندو اور مسلمان تنظیموں نے مدارس کھولنے کا ارادہ کیا۔دوسری طرف قانونی سطح پر بھی عورتوں کے حقوق کی بات کی جارہی تھی۔۱۸۲۹ء میں ستی کی رسم ممنوع قرار دی گئی تھی۔[۲۷] ۱۹۲۹ء میں بچپن کی شادی پر پابندی لگائی گئی۔[۲۸] ۱۹۳۹ء میں مسلمان عورتوں کے لیے خلع کا حق بھی تسلیم کرلیا گیا ۱۹۱۹ء میں عورتوں کو ووٹ کا حق مل چکا تھا۔[۲۹]

ان سب حالات وواقعات نے اس خطے کی عورت کی زندگی تبدیل کردی۔اسے بچپن کی شادی سے نجات ملی۔گھر سے باہر نکل کر تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا اور وہ بہت جلد اپنے احساس وجذبات کا اظہار خود کرنے لگی۔

اصلاحی نسائیت:

تعلیمِ نسواں کی جس تحریک کا اوپر تذکرہ کیا گیا اس کے نتیجے میں عورتوں کا ایک گروہ سامنے آیا جو تعلیم یافتہ تھا۔ان تعلیم یافتہ خواتین نے معاشرے کی دیگر خواتین کی بیداری اور اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔اس مقصد کے لئے خواتین نے فکشن کے میدان میں قدم رکھا۔افسانہ اور ناول تحریر کئے اور کہانی کے ذریعے عورت کے شعور کی آبیاری کی۔

یہ خواتین تخلیق کار شاید مروجہ اصطلاحی مفہوم میں feminist نہ کہلائی جاسکیں کیونکہ نہ ہی ان کے خیالات کا انداز باغیانہ تھا اور نہ ہی یہ پدرسری معاشرے یا عورتوں کی محکومی کے خلاف آواز بلند کررہی تھیں ان کا مقصد تو صرف اس عہد کے نسوانی معاشرے کی اصلاح تھا۔یہ عورتیں، معاشرے کی دوسری عورتوں کے ساتھ ایک نوعیت کا بہنا پا رکھتی تھیں۔وہ چاہتی تھیں کہ جس طرح

Scanned by CamScanner

ان کی زندگی تعلیم کے ذریعے تبدیل ہوگئی اسی طرح دوسری عورتوں کی زندگی بھی تبدیل ہو جائے ۔یوں لاشعوری طور پر سہی، وہ ایک بڑی تبدیلی کی خواہاں تھیں۔ وہ جانے انجانے میں مستقبل کی فیمنسٹ آوازوں کے لئے راہ ہموار کر رہی تھیں، اور اسی لئے ہم نے اس عہد کو اصلاحی نسائیت کا عہد قرار دیا ہے۔

تعلیم نسواں کی تحریک کے نتیجے میں شعر و ادب سے تعلق رکھنے والی کئی خواتین کے نام منظر عام پر آ گئے۔ ان خواتین میں بیشتر نثر نگار ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں اصلاحی مضامین اور گھریلو افسانے کے ذریعے خواتین کا منظر عام پر آنا ممکن ہو گیا تھا لیکن چونکہ شاعری کا تعلق عموماً عشقیہ جذبات سے رہا ہے اس لئے خوتین کی شاعری ایک معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔

نثر کے حوالے سے اس دور میں رشیدۃ النساء، محمدی بیگم، نذر سجاد، حمیدہ بانو، مسز عبداللہ سلطان بیگم، بیگم ممتاز علی، عطیہ فیضی، صغریٰ ہمایوں، کنیز فاطمہ، خجستہ اختر، ا۔ض۔ حسن بیگم، بیگم شاہنواز، طیبہ بیگم، ضیا بیگم، صالحہ عابد حسین کے نام ادبی منظر نامہ پر نظر آنے لگے۔ ان میں اکثر خواتین کا تعلق افسانوی ادب سے تھا۔

رشیدۃ النساء بیگم پہلی خاتون ہیں جنہوں نے ناول نگاری کی طرف توجہ کی۔ ان کا ناول ''اصلاح النساء'' ۱۸۸۱ء میں لکھا گیا۔ سید وقار عظیم نے اس کو خواتین کا لکھا ہوا پہلا ناول قرار دیا ہے۔ [۳۰] اس ناول میں ہندوستانی خواتین کی ایسی رسموں اور جھگڑوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو شریف خاندانوں کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ ناول کی زبان سلیس و عام ہے اور مسلم گھرانوں کی معاشرت پہ عمدگی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکبری بیگم نے اپنا ناول ''گلدستہ محبت'' ''عباس مرتضیٰ'' کے فرضی نام سے پبلک پریس مراد آباد سے چھپوایا۔ اس کے بعد ''والدہ افضل علی'' کے نام سے اس دور کے رسائل میں لکھنا شروع کیا۔ ''عفت نسواں'' ''شعلہ پنہاں'' اور ''گودڑ کا لال'' ان کے بقیہ تین ناول ہیں۔ ان

Scanned by CamScanner

میں ''گودڑ کا لال'' سب سے زیادہ مقبول ہوا۔

قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں کہ

''گودڑ کا لال'' غالباً ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ چھپتے ہی دھوم مچ گئی۔ بہت جلد مڈل کلاس مسلمان عورتوں کی بائبل کی حیثیت اختیار کر لی۔ لڑکیوں کو جہیز میں دیا جانے لگا۔'' [۳۱]

اس ناول میں نہ صرف پردہ کی بے جا پابندیوں کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے بلکہ مسلم لڑکیوں کے مخلوط تعلیم کا تصور بھی ملتا ہے۔

نذر سجاد، اردو کے پہلے افسانہ نگار اور تعلیم نسواں تحریک کے فعال رکن، سجاد حیدر یلدرم کی بیگم اور مایہ ناز ناول نگار قرۃ العین حیدر کی والدہ ہیں۔ انہوں نے بنتِ نذر الباقر کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ ان کے افسانے، مضامین اور ناول اس زمانے کے مشہور رسائل ''تہذیب نسواں''، ''خاتون'' اور ''عصمت'' میں شائع ہوئے۔ ''اختر النساء بیگم'' نذر سجاد کا پہلا ناول ہے، جو ۱۹۱۰ء میں انہوں نے صرف چودہ سال کی عمر میں لکھا۔ ''جاں باز'' (۱۹۱۸ء) سے ''عصمت'' میں قسط وار شائع ہونا شروع ہوا اور ۱۹۳۵ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ ان کے دیگر ناول ''آہ مظلوماں'' (۱۹۱۴ء)، ''ثریا'' (۱۹۳۰ء)، ''نجمہ'' (۱۹۳۹ء) اور ''حرماں نصیب'' ہیں۔ [۳۲]

مولانا رزاق الخیری، نذر سجاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

''اگر یہ بحث چھڑے کہ عورتوں میں کس نے سب سے پہلے اپنی جنس کی مظلومیت اور بے چارگی پر آنسو بہائے اور ان کے شرعی حقوق کے حصول کی انتھک کوششیں کیں، عظیم المرتبت بلند پایہ لکھنے والیوں میں اردو کی کونسی مصنفہ ہے جس کی ساٹھ برس کی تحریروں میں کتنا ہی تلاش کیا جائے مشرقی شرافت کے خلاف کوئی ایسا لفظ نہ نکلے گا جس سے نسوانی وقار مجروح ہو تو ان سوالوں میں صرف ایک نام لیا جائے

Scanned by CamScanner

گا۔ نذر سجاد حیدر!'' [۳۳]

محمدی بیگم، سید ممتاز علی کی بیگم اور ''تہذیب نسواں'' کی ایڈیٹر تھیں۔ ان کے مضامین ''تہذیب نسواں'' اور دیگر رسائل میں شائع ہوا کرتے تھے۔ محمدی بیگم نے ''صفیہ بیگم'' ''آج کل'' اور ''شریف بیٹی'' کے نام سے تین ناول لکھے۔ ان ناولوں میں بھی تعلیم نسواں کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔

اسی دور میں کئی دیگر خواتین ناول نگار سامنے آئیں۔ الف۔ ض۔ حسین بیگم نے ''روشنک بیگم''، عباسی بیگم نے ''زبیدہ بیگم''، حمیدہ سلطان مخفی نے ''ثروت آرا بیگم''، بیگم شاہنواز نے ''حسن آرا''، ظفر جہاں بیگم نے ''اختری بیگم''، طیبہ بیگم نے ''انوری بیگم''، اور ب سدید نے ''بیاض سحر'' کے نام سے ناول لکھے۔ فاطمہ بیگم، جنہوں نے ''شریف بی بی'' کے نام سے ایک رسالہ بھی مرتب کیا، کئی مضامین خواتین کے حقوق کی حمایت میں، اس دور کے جریدوں میں تحریر کئے۔ اور ''صبر کا پھل''، ''وفائے مغرب'' اور ''غیرت کی پتلی'' وغیرہ کہانیاں لکھیں۔ [۳۴]

سارا بیگم ۱۳۱۱ھ میں پیدا ہوئیں ''ماتم سروش'' کے نام سے اپنے بھائی ابو نصر فتح کے حالات قلم بند کئے جو جوانی میں فوت ہو گئے تھے۔ ''اساس القواعد'' اور ''انسداد گداگری'' آپ کی تصانیف ہیں۔ ان کی چھوٹی بہن رابعہ بیگم اردو شاعری اور نثر نگاری میں دلچسپی لیتی رہیں اور اس دور کے معیاری رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوئے۔ [۳۵]

صغریٰ بیگم ۱۸۸۴ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ [۳۶] ترقی پسند تحریک سے قبل کی ادیب خواتین میں مقبول و معروف مصنفہ ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً پندرہ ہے۔ ان کی سرپرستی میں ایک نسوانی رسالہ ''زیب النساء'' بھی جاری ہوا۔ صغریٰ بیگم ہمایوں نے نہ صرف کئی اصلاحی و معاشرتی مضامین لکھے بلکہ عملی اقدامات بھی کئے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''مقالات صغریٰ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ''سرگزشت ہاجرہ'' ان کا مقبول ترین ناول ہے۔ اس دور کی روایت کے مطابق ان کے افسانے اور ناول اصلاحی رنگ لئے ہوئے تھے۔

Scanned by CamScanner

ترقی پسند تحریک سے قبل کی خواتین مصنفین میں ایک اہم نام حجاب امتیاز علی کا ہے۔ حجاب امتیاز علی کی ساس ''محمدی بیگم'' (والدہ امتیاز علی تاج) اردو کی اولین خواتین ناول نگاروں میں سے ہیں۔ حجاب امتیاز علی نے شادی کے بعد گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ ''تہذیب نسواں'' کی ادارت بھی کی اور افسانہ نگاری کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ حجاب امتیاز کا پہلا افسانہ ''نا تمام محبت'' ہے [۳۷]۔ جو مصنفہ کے بیان کے مطابق ساڑھے گیارہ برس کی عمر میں لکھا گیا۔ حجاب امتیاز علی کے بیشتر افسانوں پہ رومانیت چھائی نظر آتی ہے۔ ''نغمات محبت''، خلوت کی انجمنیں''، ''لاش اور دوسرے ہیبت ناک افسانے'' ''ادب زریں''، ''تحفے اور شگوفے'' اور ''پاگل خانہ'' وغیرہ حجاب امتیاز علی کی دیگر افسانوی تصانیف ہیں۔ خصوصاً ان کا ناول ''پاگل خانہ'' اعلیٰ درجہ کا ناول ہے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ نثر کے میدان میں اصلاح و مقصدی کہانیوں کے توسط سے داخل ہونا آسان تھا۔ شعر و سخن کے کارزار میں اظہار صداقت کے ساتھ قدم رکھنا عورت کے لئے آج بھی آسان نہیں تو اس دور میں کیسے ممکن تھا۔ اس کے باوجود شاعری کی سطح پر چند نام نظر آجاتے ہیں، جنہوں نے ترقی پسند تحریک سے قبل، روایات سے ایک طرح کی بغاوت کی اور شریف خاندانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود شعر کہے۔ اس سلسلے میں اہم نام سعادت بانو کچلو کا ہے۔

سعادت بانو کچلو، ۱۰ جنوری ۱۸۹۳ء کو امرتسر میں پیدا ہوئیں [۳۸]۔ گھر میں ہی اردو فارسی میں مہارت حاصل کی اور انگریزی زبان سیکھنے کی طرف بھی توجہ دی۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء کے درمیان ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ ان میں ''شمس العلماء مولانا آزاد''، ''گردش زمانہ'' ،اور ''سرسید مرحوم'' خصوصی طور پہ اہمیت کے حامل ہیں اور مصنفہ کے وسیع مطالعہ کے ترجمان ہیں۔ سعادت بانو نے اردو اور فارسی کلاسیکی شعرا کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ سرسید تحریک کے زیر اثر نیچرل شاعری کی طرف توجہ کی۔ ان کی تمام تر نظمیں حب الوطنی کے جذبات سے پر ہیں۔ ان کی نظم ''تاروں سے گفتگو'' اور ''اسیر قفس'' ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئیں۔ ''اسیر قفس'' اقبال کی نظم ''ایک

Scanned by CamScanner

بلبل کی فریاد پنجرے میں'' کی تضمین ہے۔اس کے اشعار اس طرح ہیں۔

اے دل کسے سناؤں میں غم بھرا افسانہ
گلشن سے اب قفس میں میرا ہوا ٹھکانہ
رنج و الم سے دل پر لگتا ہے تازیانہ
آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

سعادت بانو ۱۹۱۵ء میں سیف الدین کچلو کی رفیقہ حیات بنیں۔ ۱۸ اگست ۱۹۷۰ء میں یہی سعادت بانو بے کسی اور مفلسی کی حالت میں خالق حقیقی سے جا ملیں۔[۳۹]

شاعرات میں زاہدہ خاتون شروانیہ کا نام اپنے دور کا سب سے نمایاں نام ہے۔گھر پر تعلیم حاصل کی۔عربی اور فارسی پہ کمال کا عبور رکھتی تھیں۔''ز۔خ۔ش'' کے نام سے ان کی نظمیں اس دور کے مشہور رسائل میں شائع ہوئیں۔ان کی نظموں کا مجموعہ ''فردوس تخیل'' ان کی وفات کے بعد ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا[۴۰]۔بیسویں صدی کے اوائل میں صرف ز۔خ۔ش ہی ایسی خاتون ہیں جو بحیثیت شاعر فی الواقع بلند مقام پہ فائز ہیں اور گرد و پیش کی سیاسی و سماجی زندگی کے بارے میں اپنی باغیانہ سوچ کو نہایت دردمندی اور تہہ داری کے ساتھ شاعری میں پیش کرتی ہیں۔ز۔خ۔ش نے مزدور، قید فرنگ اور خواتین کے مسائل پہ نظمیں کہیں۔عروج اسلام کے زمانے میں مسلم خواتین کے کارناموں کا ذکر یوں کیا ہے کہ:

ہم تھے اُس عہد ہمایوں میں نہ یوں مشق ستم
بے دل و روح اندھا دھند نہ کہلاتے تھے ہم
قفس خشت میں گھٹ گھٹ کے نکلتا تھا نہ دم
ہم نے کھائی تھی نہ یوں گھر سے نکلنے کی قسم
عفو مفلوج کی مانند نہ بیکار تھے ہم

Scanned by CamScanner

قصر اسلام کی تعمیر کے معمار تھے ہم

غزل کی ہیئت میں ''مزدور'' کے موضوع پہ خاتون زاہدہ کی نظم منفرد اور اپنی نوعیت کی اردو میں غالباً پہلی نظم ہے۔ اس نظم کے دو اشعار دیکھیے:

ثبت جس پرزہ پر ہے ملکیت سرمایہ
کس کا مرہون کرم ہے وہ سوائے مزدور
تیرے جس بید سے ہوتے ہیں قوی اسکے ضعیف
ہے تیری طرح وہ ممنون قوائے مزدور [۴۱]

''آئینہ حرم'' ایک طویل مسدس ہے جو اقبال کی ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کے بحر و وزن میں ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال کے طرز فکر اور اسلوب سے بھی ہم آہنگ ہے۔ ایک بند دیکھیے۔

میں نے مانا کہ خموشی ہے بیاں سے بہتر
لب خاموش لب شہدا نشاں سے بہتر
صبر شیون سے، شکیبائی فغاں سے بہتر
دل ہے اسرار کے رہنے کو زباں سے بہتر
پر ہر اک شے کے لئے حد ہے مقرر آخر
ضابط شکوہ بھی ہو کب تک دل مضطر آخر [۴۲]

''حیات ز۔خ۔ش'' مرتبہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ، کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ز۔خ۔ش نثر بھی اچھی لکھتی تھیں، اور غزلیں بھی کہتی تھیں۔ انہوں نے غزلوں کا مجموعہ ''نزہت الخیال'' کے نام سے مرتب کر لیا تھا اور نثری مضامین بھی یکجا کر لئے تھے۔ مگر عمر نے وفا نہ کی اور ان کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ سجاد حیدر یلدرم نے فروری ۱۹۲۳ء کے تہذیب نسواں میں لکھا۔

''وہ عندلیب خوش الحان جس کے عرفان پاش نغمے قفس کی تیلیوں

Scanned by CamScanner

سے نکل کر ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے یکا یک خاموش ہو
گئی۔۔۔۔وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی، قفس میں ہی
رہی اور قفس میں ہی دم توڑ دیا۔'' [۴۳]

''حیات ز۔خ۔ش کی مرتب انیسہ شروانی خود بھی شاعرہ تھیں۔ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۲۴ء سے ہوا۔''انیسیات'' کے نام سے مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے۔اس مجموعے میں نظم اور غزل دونوں شامل ہیں۔[۴۴]

یہ شعر دیکھئے

کب اس جہاں سے چاہ گئے جا رہی ہوں میں
جب تک بنے نباہ کئے جا رہی ہوں میں

اور یہ

کلیم اللہ پہنچے طور تک شوق تکلم میں
وہ دل میں جلوہ فرما ہے جو چاہے گفتگو کر لے

ان خواتین کے علاوہ کچھ اور شاعرات کے نام اس وقت خاصے مقبول ہوئے۔مثال کے طور پر مسز برکت جنہوں نے گیتا کا ترجمہ اردو نثر میں کیا۔مسز ڈی برکت رائے ۱۹۹۴ء میں پیدا ہوئیں۔دیوان حیدر آباد راجہ کشن پرشاد کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھیں۔بچوں کے لئے نظموں کا مجموعہ ''بچوں کے بتاشے'' کے نام سے شائع کیا۔(دکن میں اردو۔نصیر الدین ہاشمی)

خدیجہ بیگم کا تعلق معزز سرحدی خاندان سے تھا۔ان کے والد بنوں میں انسپکٹر مدارس تھے۔پردے کی قیود کے باوجود انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری اعزاز کے ساتھ لی۔۳۰ اپریل اور یکم مئی ۱۹۳۱ء کو پنجاب صوبائی کانگریس کا اجلاس راولپنڈی میں ہوا۔خدیجہ بیگم نے اس میں تقریر کی اور ایک نظم بھی پیش کی جو ان کی حب الوطنی کی مظہر ہے۔دو

Scanned by CamScanner

اشعار ملاحظہ ہوں۔

مسرور گو بظاہر رہتی ہوں میں زمن میں
کٹتا ہے وقت میرا سیر گل چمن میں
اغیار نے بٹھایا سکہ مرے وطن میں
اس سے نہ چین دل میں نے شانتی ہے من میں [۴۵]

منجھو بیگم کی متعدد نظمیں ''عصمت'' اور دوسرے خواتین کے رسالوں میں شائع ہوئیں۔ انکی نظموں کا مجموعہ مولانا رزاق الخیری نے ۱۹۲۹ء میں ''شمع خاموش'' کے نام سے شائع کیا۔ بیشتر نظمیں درد والم کا تاثر رکھتی ہیں۔ منجھو بیگم کی ایک غزل جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی اس کے چند شعر یوں ہیں

خوف عصیاں سے گھٹا کچھ، کم ہوا گریہ سے کچھ
کچھ رہا آنکھوں میں کچھ دامن کا دھبہ ہو گیا
مختصر یہ ہے کہ اک قطرہ بھی اب باقی نہیں
دل ہمارا کیا ہوا گویا تماشا ہو گیا [۴۶]

رابعہ پنہاں کی کئی نظمیں ''عصمت'' اور دیگر رسائل میں شائع ہوئیں۔ خورشید آرا اور بلقیس جمال بھی بیسویں صدی کے اوائل کی مقبول شاعرات میں شمار ہوتی ہیں گویا اس دور میں نظم و نثر دونوں حوالوں سے خوتین کے نام رسائل و جرائد کی زینت بننے لگے تھے۔ یوں ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک سے قبل یعنی ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۶ء سے پہلے ہی خواتین کے نام بحیثیت شاعر، افسانہ نگار اور مضمون نویس کے سامنے آنے لگے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ اس وقت تک معاشرے میں ایسی دقیانوسیت رائج تھی کہ حب الوطنی ، آزادی اور اصلاح قوم کے علاوہ کسی موضوع پر قلم اٹھانا عورت کے لئے آسان نہ تھا۔ بلکہ ان موضوعات پر بھی کئی خواتین نے اپنے نام مخفی رکھتے ہوئے قلم اٹھایا اور ناول یا افسانے لکھے یا شعر

Scanned by CamScanner

کیے۔اسی رجعت پسندی کی مثال کے سلسلے میں قمر زمانی بیگم کا واقعہ پیش کیا جاسکتا ہے۔قمر زمانی بیگم کی حقیقت سے اب اہل علم پوری طرح واقف ہیں اور ان کی داستان جملہ تفصیل کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔[۴۷]

قمر زمانی بیگم کا حقیقتاً کوئی وجود نہیں تھا بلکہ علامہ نیاز فتحپوری، قمر زمانی بیگم کے نام سے بائیں ہاتھ سے خطوط و مضامین اور افسانے لکھتے تھے۔یہ خطوط ل۔احمد اور ضیاء عباسی ہاشمی کی مشاورت اور امداد سے ماہنامہ ''نقاد'' کے مدیر شاہ دلگیر کو بھیجے گئے تھے۔ان خطوط کا یہ اثر ہوا کہ قمر زمانی بیگم کا نام نقاد کی ادارت میں شامل ہو کر سامنے آیا اور علمی ادبی حلقوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور کئی خواتین رسائل میں نظر آنے لگیں۔

شعر گوئی اور اصلاحی افسانہ نویسی کی اس فضا میں خواتین کی تعلیم پر جہاں راشد الخیری اور دیگر حضرات نے توجہ دی ہے علامہ نیاز فتحپوری جو اپنی آزاد خیالی اور حریت قلم کے لئے خاص شہرت رکھتے تھے۔اس سلسلے میں خاص طور پر قلم اٹھایا۔ماہنامہ نگار جو ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا دس پندرہ برس کے اندر ہی اپنی آزاد خیالی کے سبب عورتوں اور مردوں دونوں میں مقبول ہوا۔علامہ نیاز نے عورتوں کی تعلیم معاشرے میں ان کے کردار کی اہمیت اور تمدنی زندگی میں ان کے کارناموں پر خاص توجہ دی۔ان کے ناولٹ ''نقاب اٹھ جانے کے بعد'' اور ''شباب کی سرگزشت'' جو بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں شائع ہوئے یوں قابل ذکر ہیں کہ ان میں بھی خواتین کی ہمت افزائی اور ان کے تحفظ کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے فنون لطیفہ کے حوالے سے عورتوں کی خدمات پر پے در پے مقالے لکھے اور ''گہوارہ تمدن'' [۴۸] کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کر دی۔عورتوں کے حقوق اور کارناموں پر یہ پہلی قابل توجہ کتاب ہے۔جسے حلقہ نیاز و نگار نے ۱۹۹۳ء میں ''عورت اور فنون لطیفہ'' [۴۹] کے نام سے دوبارہ شائع کر دیا ہے۔علامہ نیاز نے اس عرصے میں مذہبی تنگ نظری اور فرقہ واریت پر بھی خاص طور پر قلم اٹھایا۔مذہب کی دقیانوسیت اور کٹھ ملاؤں کی رجعت پسندی پر کھل کر لکھا۔ہر چند کہ مذہب

Scanned by CamScanner

اور عقلیت کے باب میں ان کے خیالات سرسید اور شبلی سے الگ نہ تھے۔ بلکہ ان کی تقلید ہی میں تھے لیکن ان کی فکر و قلم میں ایسی کاٹ تھی کہ مسلمانوں کا مولوی طبقہ ان سے بپھر گیا اور جس طرح انہوں نے سرسید، شبلی اور اقبال وغیرہ پر کفر کے فتوے جاری کئے تھے اسی طرح نیاز کو بھی ملعون و مردود قرار دے دیا۔ لیکن ان فتووں کا معاشرے پر الٹا اثر ہوا۔ نیاز نے نگار کے ذریعے آزادی فکر و نظر کا جو پرچار کیا تھا وہ کارگر ثابت ہوا۔ خصوصاً تعلیم یافتہ طبقے نے جلد اس کا اثر قبول کیا۔ یہ فکر و نظر کی آزادی ہی تھی کہ نگار میں نیاز فتحپوری جہاں نئے لکھنے والوں اور نئی کتاب کا ذکر کرتے تو خواتین کو بھی برابر کی اہمیت دیتے تھے۔ مثلاً جولائی ۱۹۲۲ء کے نگار میں ز۔ خ۔ ش ''آئینہ حرم'' جولائی ۱۹۳۲ء میں رسالہ ''عصمت'' اور اپریل ۱۹۳۴ء میں نگار میں حجاب اسماعیل کے افسانوں پہ نیاز نے تبصرے کئے۔ یہی نہیں بلکہ بعض غیر معروف خواتین کے نام اور کتابیں بھی نیاز صاحب کے تبصروں کے ذریعے منظر عام پر آئیں۔

غرض یہ کہ نیاز کے خیالات و افکار نے شعر و ادب خصوصاً اردو نثر پر گہرے اثرات مرتب کئے اور آزاد خیالی کا ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ ادیبوں کے سوچنے کا انداز یکسر بدل گیا۔ پریم چند نے معاشرے کی نچلی اور متوسط سطح پر افسانے اور ناول کے حوالے سے اگرچہ بہت سی اصلاحی صورتیں پیدا کر دی تھیں لیکن نیاز کی تحریروں نے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کو خاص طور پر متاثر کیا۔ پروفیسر احتشام حسین نے درست لکھا ہے کہ

> ''سرسید کی اصلاحی اور ترقی پسندی کی انقلابی تحریکوں کے درمیان جس قسم کی عقلیت پرست روایت شکنی کی نمود ہوئی اس کی سب سے نمایاں مثال نیاز فتحپوری کی تھی۔ نیاز نے ادب و فکر کو بے باکی سکھائی جس کے بغیر نئے لکھنے والوں کے قلم میں وہ شوخی اور قوم میں وہ طاقت مشکل سے آسکتی تھی، جس کی اس وقت ضرورت تھی''۔[۵۰]

رفتہ رفتہ زندگی اور فن کے مسائل اور ان کے باہمی تعلق پر غور کیا جانے لگا۔ ڈاکٹر اختر

Scanned by CamScanner

حسین رائے پوری اور پروفیسر مجنوں گورکھپوری ،علامہ نیاز کے زیر اثر خاص طور پر آگے بڑھے۔ان سب کوششوں کا نتیجہ یہ کہ ۱۹۳۶ء میں باقاعدہ ادیبوں کی ایک تنظیم انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے سامنے آگئی اور اس کی بنیاد رکھنے والوں میں اور بحیثیت قلم کار ہاتھ بٹانے والوں میں مردوں کے دوش بدوش نہیں بلکہ مردوں سے آگے بڑھ کر نام کرنے والوں میں خواتین کے نام ہیں۔

شعروادب کے حوالے سے ترقی پسند تحریک بے حد اہم تحریک ہے اور اس کا ذکر آئندہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ کیا جائے گا۔اس سے پہلے اس وقت یہاں ٹھہر کر اسی دور میں زور پکڑ لینے والی تحریکِ آزادی کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔

تحریکِ آزادی کی نسائی آوازیں:

خواتین کی بیداری کی یہ لہر جو علیگڑھ تحریک کے زیر اثر بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں بروئے کار آئی اس کا سیاسی پس منظر دیکھئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وہ دور تھا جب آزادی کی تحریک روز بروز زور پکڑتی جارہی تھی ،دوقومی نظریے کی تحریک چل پڑی تھی ،اور سرسید احمد خان کی بنا کردہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ۱۹۰۳ء میں ''انجمن ترقی اردو'' اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ وجود میں آئی ،جن کے نتیجے میں دوقومی نظریہ کی تحریک آگے بڑھی یہاں تک کہ ۱۹۰۹ء میں لارڈ منٹو مارلو اصلاحات کے تحت حکومت برطانیہ نے بھی مسلمانوں کے اس مطالبے کو مان لیا کہ ہندو مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔چند سال بعد ۱۹۱۶ء میں لکھنو پیکٹ وجود میں آیا اور اس پیکٹ کے تحت کانگریس نے بھی دوقومی نظریے کو تسلیم کرلیا۔

اسی زمانے میں ایم اے او کالج کو ''مسلم یونیورسٹی علیگڑھ'' کا چارٹر دلوانے کی تحریک شروع ہوئی اور اس تحریک میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی بھرپور حصہ لیا اور دسمبر ۱۹۲۰ء

Scanned by CamScanner

میں مسلم لیگ یونیورسٹی علیگڑھ، باقاعدہ وجود میں آئی۔[۵۱] ایم۔اے۔او کالج کے بعض سابق طالبعلموں نے جن میں محمد علی جوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین پیش پیش تھے علی گڑھ یونیورسٹی کے متوازی ایک نئی یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی، یہ یونیورسٹی جامعہ ملیہ دہلی کے نام سے قائم ہوئی۔ انہی دنوں میں حیدرآباد دکن میں ''عثمانیہ یونیورسٹی'' کے قیام کا اعلان ہوا۔[۵۲] اس کا ذریعہ تعلیم ہر سطح پر اردو تھا۔ گویا چند سال کے اندر ہی تین بڑی جامعات مسلمانوں کی توجہ سے، حیدرآباد، علیگڑھ اور دہلی میں قائم ہو گئیں۔ ادھر پنجاب، سرحد، اور سندھ میں ''اسلامیہ کالج لاہور'' ''اسلامیہ کالج پشاور'' اور ''سندھ مدرستہ الاسلام'' وغیرہ وجود میں آ چکے تھے۔ ان میں بعض اداروں نے مخلوط تعلیم کی اجازت دی اور بعض نے خواتین کے لئے علیحدہ تعلیم کا انتظام کیا۔ ان سب کا اثر یہ ہوا کہ مسلم خواتین کی اچھی تعداد، نہ صرف اسکولوں کی سطح پر بلکہ کالج کی سطح پر بھی پہنچ گئی اور وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر شعر و ادب کی دنیا میں بھی انہوں نے اپنا کردار ادا کیا۔

تعلیم و تدریس کے ان اداروں کی تاسیس و توسیع کے ساتھ ساتھ پورے برصغیر میں بیداری کی لہر موجزن تھی۔ اس دور کی صحافت کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ حسرت موہانی کے ''اردوئے معلیٰ'' عبدالحلیم شرر کے ''دلگداز'' محمد علی کے رسالے ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ'' مولانا ابو الکلام آزاد کے رسالے ''الہلال'' اور مولوی ظفر علی خان کے ''زمیندار'' نے صحافت میں دھوم مچائی ہوئی تھی۔ ادبی پرچوں میں شیخ عبدالقادر کا ''مخزن'' لاہور، منشی دیا نرائن نگم کا ''زمانہ کانپور''، ظفر علی خان کا ''دکن ریویو''، ظفر الملک علوی کا ''الناظر''، منشی نوبت رائے نظر کا ''ادیب'' اور تاجور نجیب آبادی کا ''ہمایوں'' جیسے رسائل نے سیاسی و تہذیبی زندگی میں زبردست شور و غوغا پیدا کر رکھا تھا۔ اقبال کی نظموں میں ''شکوہ''، ''جواب شکوہ'' اور پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد ''طلوع اسلام'' اور ''خضر راہ'' نے بھی مسلمان مرد و خواتین کے جذبات میں ایک تموج پیدا کر دیا تھا۔

اسی دور میں نشاط النساء بیگم (بیگم حسرت موہانی) علم و ادب، شعر و سخن اور سیاست و معاشرت، سب حوالوں سے میدان میں آ گئیں۔ نشاط النساء بیگم گھر کی تعلیم یافتہ تھیں لیکن

Scanned by CamScanner

انہیں عام رواج کے مطابق صرف مذہبی تعلیم ہی نہیں دلائی گئی تھی بلکہ مذہبی تعلیم کے علاوہ اردو اور عربی زبانوں کی معقول تعلیم بھی دلائی گئی۔ شادی ہونے سے قبل تک آپ کا خاص مشغلہ یہ تھا کہ پس ماندہ قصبے کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں اور بقول شخصے اگر آج موہان میں تعلیم نسواں کی جھلک نظر آتی ہے تو محترمہ نشاط النساء بیگم کی کوشش اور مالی ایثار کا ثمرہ ہے۔'' [۵۳] گویا نشاط النساء بیگم میں حسرت موہانی جیسی شخصیت کا ہمسفر بننے کی صلاحیت پہلے ہی موجود تھی۔ مولانا حسرت موہانی اور علی گڑھ تحریک کی فضاء نے اس صلاحیت کو مزید جلا بخشی اور انہوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو ایک نوجوان خاتون کی حیثیت میں شاید ہی کسی نے انجام دیے ہوں۔

نشاط النساء ''پہلی مسلم خاتون تھیں جنہوں نے آزادی کا علم بلند کیا۔ مولانا محمد علی کی والدہ (آبادی بیگم) بیگم حسرت موہانی کے بعد ہی جنگ آزادی میں شامل ہوئیں''۔ [۵۴] نشاط النساء بیگم غالباً ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۰۸ء میں جب حسرت موہانی کو گرفتار کیا گیا تو بیگم حسرت موہانی عملی طور پر سیاست کے میدان میں آ گئیں۔ وہ عوام رواج اور تصورات کو رد کر کے باقاعدگی سے حسرت سے ملنے کے لئے جیل جاتی رہیں۔ ۱۹۱۶ء میں جب حسرت موہانی کو دوبارہ گرفتار کیا گیا تو نشاط النساء بیگم نے پردہ ترک کیا اور حسرت کے مقدمات کی پیروی کے لیے گھر سے باہر آ گئیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں کہ

> ''بیگم حسرت پہلی مسلم خاتون ہیں جنہوں نے ایک مقصد کے لئے پردہ ترک کیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں تیس اکتیس سال کی جوان عورت کے لئے برقعہ اتارنے کے لئے بڑی ہمت اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ یہ کام آہنی عزم رکھنے والی خاتون نشاط النساء بیگم ہی کر سکتی تھیں۔'' [۵۵]

بیگم حسرت نے نہ صرف حسرت کے مقدمات کی پیروی کی بلکہ وہ سیاسی جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتی تھیں۔ ساتھ ساتھ انہوں نے اخبارات کے ذریعے عوام کو حسرت کے

Scanned by CamScanner

حالات سے باخبر رکھا اور اپنے عہد کے بڑے سیاسی رہنماؤں سے خط و کتابت کے ذریعے مسلسل رابطہ بھی برقرار رکھا اور اس طرح بقول عتیق احمد صاحب بڑی ہمت کے ساتھ ''پبلک ریلیشن آفیسر'' کی خدمات انجام دیں۔(۵۶]

بظاہر یوں محسوس ہوتا تھا کہ نشاط النساء بیگم کا تعلق صرف حسرت کی سیاسی زندگی سے تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ حسرت کے ادبی کاموں میں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔ حسرت ان کو غزلیات سناتے جس پر وہ تبصرہ کرتی تھیں۔[۵۷] حسرت کی گرفتاری کے دوران انہوں نے حسرت کے چھ دواوین (پنجم تا دہم) مرتب کر کے شائع کئے اور ان کے اشاعتی ادارے کو کسی نہ کسی طرح فعال رکھا۔ ان کے سفر حج کے دوران اپنی بیٹی کو لکھے گئے خطوط حسرت نے ''سفر نامہ عراق و حجاز'' کے عنوان سے اردوئے معلیٰ میں دو قسطوں میں شائع کئے اور اس پہ دو صفحات کا دیباچہ یا پیش لفظ ''تنقید رسائل کتب'' کے نام سے تحریر کیا۔

حسرت کے رسالے ''اردوئے معلیٰ'' کے اجراء میں، اسے کسی نہ کسی طور پہ جاری رکھنے میں، حسرت کی زندانی شاعری کو محفوظ کرنے میں، ان کے سیاسی مضامین کو شائع کرانے میں، ان کے کلام کے مجموعے شائع کر کے دوسروں تک پہنچانے میں اور حسرت کے دیگر علمی و ادبی کاموں میں بیگم حسرت نے جس طرح حسرت کا ہاتھ بٹایا اس کا سب ہی نے اعتراف کیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ

> ''ہر قسم کی مشکلوں کو بہادری اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت ان کے مقابلے کی نکل سکے۔''[۵۸]

نشاط النساء بیگم کا انتقال ۱۸ اپریل، ۱۹۳۷ء کو ہوا۔ حسرت نے بیگم کے انتقال پر ''بیگم حسرت'' کے نام سے مضمون شائع کیا۔ اس کے بعد اب تک نشاط النساء پر متعدد کتابیں اور درجنوں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے جن کارناموں کا یہاں سرسری تذکرہ کیا گیا، وہ سب

Scanned by CamScanner

خواتین کی ہمت افزائی کا وسیلہ بنے اور ان کے ذہن سے وہ جھجک دور ہونے لگی جو انہیں اس سے پہلے ضرورت پڑنے پر بھی نقاب الٹ کر میدان میں آنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔

اسی دور میں ایک اہم واقعہ تحریک خلافت کی صورت میں رونما ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد برطانوی حکومت نے اہل پاک و ہند سے آزادی کے جو وعدے کئے تھے وہ پورے نہ کئے بلکہ جنگ کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمانوں کے دوست ملک ترکی میں نہ صرف خلافت سے منسوب حکومت کو ختم کر دیا بلکہ ترکی کے بعض علاقے جو یورپ سے ملے ہوئے تھے ہڑپ کر لئے۔ یہ سب اس وجہ سے کیا گیا کہ ترکی، جرمنی کا اتحادی تھا یعنی جرمنوں کے ساتھ مل کر برطانیہ کے خلاف لڑ رہا تھا۔ برطانیہ نے ترکی کو جو سزا دی اس کا ردعمل ساری دنیا میں ہوا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے خاص طور پر اثر لیا اور وقتی طور پر ہندو مسلمان اور کانگریس اور مسلم لیگ اس طرح متحد ہو گئے کہ مشترکہ سیاسی جلسے ہونے لگے۔ مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو، حسرت موہانی، مدن موہن مالویہ، ظفر علی خان، مولانا محمد علی، اور شوکت علی، غرض کہ قوم کے بڑے لیڈر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ''خلافت تحریک'' کے نام سے انگریزوں کے خلاف تقریر کرنے لگے۔ خلافت تحریک جس کا بنیادی تعلق ترکی اور برصغیر کی آزادی سے تھا۔ ایک سیاسی طوفان ثابت ہوئی۔ یہ بیسویں صدی کی سب سے طاقتور متحدہ تحریک تھی لیکن کانگریس اور ان کے رہنمائے خاص مہاتما گاندھی نے خلافت تحریک کے عین شباب کے وقت اس کو دھوکہ دیا اور تحریک کے وہ مقاصد حاصل نہ ہوئے جس کے لئے وہ وجود میں آئی تھی۔ پھر بھی اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کانگریس یا ہندوؤں کے عزائم کھل کر مسلمانوں کے سامنے آ گئے اور مسلمانوں میں یکجہتی اور اتحاد کی لہر پیدا ہوئی۔ بہر حال تحریک خلافت کے ذریعے صرف مرد نہیں خواتین بھی سیاست کے میدان میں اتر آئیں۔ ان خواتین میں محمد علی اور شوکت علی کی والدہ، مولانا حسرت کی بیگم۔ بیگم اعزاز رسول، امجدی بیگم (بیگم محمد علی)، سعادت بانو کچلو، زلیخا بیگم (بیگم ابوالکلام آزاد)، بیگم شیخ عبداللہ، بیگم نواب بھوپال وغیرہ نے خاص کردار ادا کیا۔ خلافت تحریک کے بہانے محمد علی جوہر اور شوکت علی پر خالقدینا ہال کراچی

Scanned by CamScanner

میں بغاوت کا مقدمہ چلا تو اس زمانے میں سہارن پور کے ایک گم نام شاعر منشی نور محمد نے چھ بندوں پہ مشتمل ایک نظم ''صدائے خاتون'' تحریر کی جس کو محمد قادر حسین نے ''بی اماں کا پیغام فرزند کے نام'' سے مدراس میں طبع کیا۔ یہ نظم ہندوستان کے طول و عرض میں نغمہ حریت بن کر مقبول ہوئی، اور آج تک اس طرح کے مصرعے کہ

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
تم جاتے ہو دو دو برس کو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ پڑھ کے پھانسی پر چڑھنا
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

آج تک ذہنوں میں محفوظ ہے۔

بی اماں کا اصل نام ''آبادی بانو'' تھا۔ ان کے بیٹے، ان کو بوا اور پوتے پوتیاں ''بی اماں'' کہہ کر پکارتے تھے۔ بی اماں امروہہ ضلع مرادآباد کی رہنے والی تھیں۔ ان کی پیدائش اور عمر کے بارے میں محمد علی نے کامریڈ میں لکھا کہ ''بی اماں کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں البتہ مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ غدر کے زمانے میں میری عمر پانچ چھ سال کی تھی''۔ اس کی بنیاد پر مولانا نے ان کا سال پیدائش ۱۸۵۲ء اور ان کی عمر ۷۲ سال لکھی ہے۔ [۵۹] شوہر عبدالعلی کا تعلق رام پور سے تھا۔ ۲۷ سال کی جوان عمر میں بیوہ ہوگئی تھیں۔

بی اماں کا شمار ان قابل افتخار ماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے آزادی کے مایہ ناز علمبرداروں کی تربیت کی۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی کی تاریخ ساز شخصیات کی تعمیر بی اماں ہی کی مرہون منت ہے۔ خود مولانا محمد علی جوہر لکھتے ہیں کہ

''علاوہ اس فیض گراں مایہ کے جو شوکت صاحب کی محبت، نگرانی اور

Scanned by CamScanner

ترغیب وتحریص کی بدولت مجھے نصیب ہوا ہے، میں جو کچھ ہوں اور جو
کچھ میرے پاس ہے وہ خداوندا کریم نے مجھے اس مرحوم (بی اماں
) کے ذریعے پہنچایا ہے''۔[۶۰]

پہلی جنگ عظیم سے پہلے بی اماں کا زیادہ تر وقت گھریلو کاموں اور ہمسایوں کی مدد کرنے میں گزرتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران ہی ''قانون تحفظ ہند'' نافذ کیا گیا اور اس کی نفاذ کے دو مہینے بعد ہی مولانا محمد علی شوکت کو اشتعال انگیز مضمون لکھنے کے جرم میں چھندواڑن جیل میں نظر بند کیا گیا یہیں سے بی اماں کی سیاسی زندگی کا عملی طور پر آغاز ہوتا ہے۔ پھر جب ستمبر ۱۹۲۱ء میں علی برادران کو گرفتار کیا گیا تو بی اماں نقاب اتار کر ۷۰ برس کی عمر میں ایک مجاہدہ کی طرح میدان میں آ گئیں۔ وہ لمبے لمبے سفر کر کے جلسوں میں پہنچتیں اور اپنی تقریروں سے مجمع میں ایک نیا ولولہ بیدار کر دیتیں۔ چناں چہ آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک سالانہ اجلاس میں جو کلکتہ میں منعقد ہوا بی اماں کی طرف سے ایک پیغام بنام مسلمان ہند پڑھ کر سنایا گیا جس کے ولولہ انگیز الفاظ نے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس پیغام کو پڑھ کر سنانے کے فرائض محترم قاری عبدالغفار نے انجام دئے۔ دہلی کے ایک صاحب کے بیان کے مطابق بی اماں کے پیغام عمل میں ایک ایک لفظ تیر ونشتر کا کام دے رہا تھا اور جس نے اجلاس لیگ کو مجلس ماتم بنا دیا۔ بی اماں کا انتقال ۱۲' ۱۳ نومبر کی درمیانی شب ۱۹۲۴ء میں دہلی میں ہوا۔ اس طرح ۷۲ برس کی عمر میں یہ عظیم مجاہدہ اپنے آخری سفر پہ روانہ ہوئی۔ آبادی بیگم اور نشاط النسا بیگم کے علاوہ کئی دیگر خواتین کے نام بھی اس دور کے سیاسی منظر نامہ پر آتے ہیں مثلاً امجدی بیگم یعنی بیگم مولانا محمد علی جوہر۔ امجدی بیگم ہر جلسہ اور ہر سفر میں خلافت کانفرس میں مولانا کے ساتھ شریک رہا کرتی تھیں اور جلوسوں اور دوسری کاروائیوں میں حصہ لیتی تھیں۔ کانگریس میں شامل رہیں مگر بعد میں کانگریس پارٹی کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر مسلم لیگ میں شمولیت حاصل کر لی۔ ۱۹۴۶ء میں خالق حقیقی سے جا ملیں۔

Scanned by CamScanner

بیگم خورشید خواجہ (۱۹۸۱،۱۸۹۶) کے والد سمیع اللہ خان سر سید احمد خان کے قریبی ساتھیوں میں تھے اور ان کے شوہر علی گڑھ کے مشہور بیرسٹر اور جنگ آزادی کے نامور مجاہد خواجہ عبدالمجید صاحب تھے۔شادی کے بعد خورشید بیگم نے پردہ ترک کر دیا اور تحریک آزادی میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔

زلیخا بیگم' مولانا ابوالکلام آزاد کی بیگم تھیں۔ انہوں نے ساری زندگی آزادی کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیا اور ۱۹ اپریل' ۱۹۴۳ء کو جب کہ آزاد جیل میں تھے' اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

زبیدہ بیگم داؤدی (پیدائش اکتوبر' ۱۸۸۵ء) بہار کے مشہور ایڈوکیٹ اور سیاسی رہنما شفیع داؤدی کی بیگم تھیں۔ زبیدہ بیگم پردہ نشیں خاتون تھیں مگر شوہر کے ہمراہ نہ صرف یہ کہ عوامی جلسے میں شریک ہوتیں بلکہ خود بھی خواتین کے جلسے منعقد کرتی تھیں۔ مولانا داؤدی کی کانگریس سے علیحدگی اور ۱۹۳۷ء میں احرار پارٹی کی شکست کے بعد' مولانا داؤدی اور زبیدہ بیگم نے بقیہ زندگی خاموشی سے گزاری۔

کنیز سیدہ بیگم' منیزہ بیگم' عصمت آراء بیگم' صغری خاتون وغیرہ کے نام بھی تحریک آزادی میں حصہ لینے والی اہم مسلمان خواتین میں شمار ہوتی ہیں۔

خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ کے جرنل ۶۳ تا ۶۸ میں ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین کا ایک طویل اور قابل قدر مقالہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ شائع ہوا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کی جنگ چونکہ ساتھ لڑی گئی اس لئے اس مقالے کا عنوان حقیقتاً بر صغیر کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ ہونا چاہیے تھا اور ان خواتین میں ان کا ذکر بھی شامل ہونا چاہیے تھا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے آزادی کی تحریک میں شامل ہوئی تھیں۔لیکن اس میں عموماً ایسی خواتین کا ذکر کیا گیا ہے جو کانگریس سے وابستہ رہیں۔ اس سلسلے میں درجنوں مسلم خواتین کا تذکرہ آیا ہے اور یہ تذکرہ جیسا کہ مقالے کے عنوان سے ظاہر ہے کہ سیاسی حوالے سے

Scanned by CamScanner

ہے۔ تاہم انہوں نے چند ایسی خواتین کا تذکرہ بھی کیا ہے جو شعر و ادب سے وابستہ تھیں۔

اس سیاسی فضا کے ساتھ ساتھ بلکہ اسی فضا سے منسلک ایک اور ثقافتی و لسانی تحریک سامنے آئی اور اس میں بھی مسلمان عورتوں اور مردوں نے بہت فعال کردار ادا کیا۔ ہوا یہ کہ اس دور میں جب تحریکِ آزادی زوروں پر تھی متعصب ہندوؤں نے اس گنگا جمنی تہذیب یا ہندلمانی تہذیب کو، زندگی کی ہر سطح پر نظر انداز اور پامال کرنا شروع کر دیا نظر انداز کر دیا جو مسلمانوں کے ہندوستان میں آمد کے بعد پیدا ہوئی تھی اور جس کی سب سے واضح نشانی ''اردو'' تھی۔ اسی مشترکہ تہذیبی علامت یعنی اردو کے خلاف ہندوؤں نے اور کانگریس حکومت نے باقاعدہ تحریک شروع کر دی۔ ان کا مطالبہ یہ تھا اردو کو فارسی رسم الخط کے بجائے ناگری رسم الخط میں لکھا جائے اور اسے اردو کے بجائے ہندوستانی یا ہندی کہا جائے۔ ظاہر ہے یہ مطالبہ مسلمانوں کے ثقافتی اور تہذیبی وجود پر چھری چلانے کے مترادف تھا اس لیے مسلمان کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے اور جب کانگریس کے زعماء کی طرف سے یہ اعلان ہونے لگا کہ اردو، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان نہیں بلکہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو پھر مسلمانوں نے اس کو اپنانے، اس کا تحفظ کرنے اور اس کو ترقی دینے کی ذمے داریاں بھی قبول کر لیں۔

''انجمن ترقی اردو'' (قیام ۱۹۰۳ء) کا صدر دفتر جو ابھی تک اورنگ آباد (دکن) میں تھا، اسے مولوی عبدالحق ۱۹۳۷ء میں دہلی لے آئے اور اردو کی ترویج و اشاعت اور مسلمانوں کے تہذیبی و سماجی اور سیاسی ترجمان کی حیثیت سے سہ ماہی ''اردو'' ماہنامہ ''قومی زبان'' کے ساتھ ہفت روزہ ''منشور'' کا بھی اجراء کر دیا۔ منشور کے پہلے ایڈیٹر مولانا حسن ریاض مقرر ہوئے۔ انجمن کے دہلی آجانے کے بعد تالیف و تصنیف کے کام کو بھی فروغ ہوا اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۰ء کے درمیان متعدد تحقیقی، تنقیدی اور تاریخی کتابیں انجمن کی طرف سے شائع کی گئیں۔ اس سلسلے میں عورتوں اور مردوں دونوں نے کام۔ انجمن ترقی اردو کی باقاعدہ زنانہ شاخ بھی قائم کر دی گئی تھی جس میں اس دور کی تعلیم یافتہ خواتین نے بھی حصہ لیا۔[۶۱]

Scanned by CamScanner

ترقی پسند نسائیت:

سیاسی، ثقافتی اور لسانی فضاء سے قطع نظر بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں اردو ادب کی سطح پر کئی دھماکے ہوئے۔ ان دھماکوں کی ایک صورت اختر حسین رائے پوری کا مضمون ''ادب اور زندگی'' تھا جو ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی اردو کے رسالے ''اردو'' میں شائع ہوا[۶۲]۔ اس کے بعد مجنوں گورکھپوری کا مضمون ''ادب اور زندگی'' شائع ہوا۔[۶۳] ان مضامین میں ادب کی تعریف و تفہیم، ادب اور زندگی کا باہمی تعلق اور اجتماعیت و انفرادیت جیسے مسائل پر بحث کا آغاز ہوا۔ یہ گویا ترقی پسند تنقید کی بنیاد تھی اس سے پہلے تخلیقی سطح پر ایک اور تہلکہ انگیز کتاب منظر عام پر آئی۔ اس کا نام تھا ''انگارے'' یہ کتاب جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی انقلابی افسانوں کا مجموعہ تھی۔ اس میں پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں، سجاد ظہیر اور پروفیسر محمود الظفر کی تحریریں شامل تھیں۔ ان افسانہ نگاروں نے شعوری طور پر سماجی اور مذہبی مسلمات، کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس لئے نہیں کہ ان ادیبوں کے نزدیک ہندوستان کا بنیادی مسئلہ مذہب تھا بلکہ اس لئے کہ وہ ادب اور سماج کے تعلق کا اور اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کو نئی تکنیک سے بھی روشناس کرانا ان کا مقصد تھا۔ احمد علی نے خود بھی اپنے ایک مضمون لکھا ہے کہ

> ''اس تحریک کے اصل بانیوں کے ذہن میں اس وقت کوئی خاص سیاسی یا نظریاتی مقاصد نہ تھے جب بڑے گرم گرم مباحثوں اور تخلیقی جوش و خروش کے بعد انہوں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' ۱۹۳۲ء میں شائع کر کے اس تحریک کی داغ بیل ڈالی اور اس کی بنیاد رکھی، ہمیں یہ خیال ضرور تھا کہ اس کے شائع ہونے پر مخالفت ہوگی لیکن اس بات کا سان و گمان بھی نہ تھا کہ یہ مخالفت اس قدر شدت

Scanned by CamScanner

اختیار کرے گی کہ ملک بھر میں تہلکہ مچ جائے گا۔'' [۶۴]

جیسا کہ احمد علی کے بیان سے ظاہر ہے کہ انگارے ایک طرح کا تجربہ تھا جس میں بقول سجاد ظہیر'' سنجیدگی اور ٹھہراؤ کم اور سماجی رجعت پسندی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زیادہ تھا''۔[۶۵]

''انگارے'' کا ادبی معیار جو بھی ہو اس کے تاریخی مقام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب کی مخالفت میں سہ روزہ ''مدینہ'' بجنور کے مدیر اعلیٰ حامد اللہ انصاری غازی ہفت روزہ ''سچ'' لکھنو کے مدیر عبدالماجد دریابادی اور سہ روزہ ''سرفراز'' کے مدیر نے اداریے تحریر کئے اور کئی اخبارات نے اس مجموعے پر شدید ، اعتراضات کیے۔ چناں چہ مارچ ۱۹۳۳ء میں ''انگارے'' پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس پابندی کے جواب میں ''انگارے کے مصنفین نے ایک بیان ''انگارے کے دفاع میں'' کے عنوان سے اخبار ''لیڈر'' میں شائع کیا جس میں ایک طرف بڑی جرات مندی کے ساتھ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ''انگارے'' کے مصنفین اس کی اشاعت پر کسی طرح نادم نہیں ہیں اور دوسری طرف ایک تجویز یہ پیش کی گئی تھی کہ

> ''ہماری عملی تجویز یہ ہے کہ ایک ''لیگ آف پراگریسو آتھرس'' قائم کی جائے جو اس قسم کے مجموعے وقتاً فوقتاً انگریزی اور ملک کی دوسری مقامی زبانوں میں شائع کرے''[۶۶]

اس بیان میں ''پراگریسو'' کی اصلاح استعمال کی گئی تھی جس کا اردو ترجمہ ''ترقی پسند کیا گیا، اور ایسے حالات سے نپٹنے کے لئے ہم خیال ادیبوں کی ایک انجمن League of Progressive Authors کے نام سے تشکیل دی گئی۔ اس سلسلے میں احمد علی کہتے ہیں کہ۔

> ''محمود الظفر نے میرے اور رشید جہاں کے مشورے سے ۱۹۳۳ء میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کے قیام کا اعلان کیا۔۔۔۔ ۳۳۔۱۹۳۲ میں اس کے بانیوں مبانیوں کے سامنے جو مقصد تھا وہ

Scanned by CamScanner

بالکل ادبی تھا اور اس میں سیاسی رجحانات اس سے زیادہ نہ تھے کہ ہم
ان تمام اہم مسائل زندگی پر آزادی رائے اور تنقیدی حق چاہتے تھے
جو نسل انسانی بالعموم اور برِ صغیر کے لوگوں کو بالخصوص درپیش
ہیں'' [٦٧]

جولائی ۱۹۳۵ء میں دنیا کے چند ادیبوں نے پہلی بار ادب کو تحریک بنانے پر زور دیا۔ یہ کانفرنس "World Congress of the Writer for the Defence of Culture" کے نام سے بنائی گئی اور اس میں فن کا بنیادی مقصد انسانیت کی خدمت کو قرار دیا گیا اور تہذیبی اقدار کی حفاظت اور نازی ازم اور فاشزم کا مقابلہ کرنے کا عہد کیا گیا۔ ہنری بارلس، میکسم گورکی، روماں رولاں، تھامسن مان، اندرے مارلو اور والڈ فرینک وغیرہ اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ہندوستانی ادیبوں کی نمائندگی ایک پارسی خاتون صوفیہ واڈیا نے کی۔

۱۹۳۴ء میں احمد علی کے افسانوں کا مجموعہ ''شعلے'' شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا تھا۔ اختر حسین رائے پوری کا مضمون ''ادب اور زندگی'' بھی ۱۹۳۴ء میں ہندی میں شائع ہوا تھا بعد ازاں جولائی ۱۹۳۵ء میں یہ "اردو" میں شائع کیا گیا۔ اسی سال لندن کے ناٹنگ ریستوران مین انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا اعلان نامہ تیار ہوا۔ اس اعلان نامے کے برِ صغیر پہنچنے پر بیشتر مصنفین نے جس میں پریم چند، حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، علامہ نیاز فتحپوری، ڈاکٹر عابد حسین، جوش ملیح آبادی، اور فراق گورکھپوری وغیرہ شامل ہیں۔ اس اعلان نامے پر دستخط کر دیے۔

اس ترقی پسند تحریک کا پہلا اجلاس ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنو میں منعقد ہوا۔ اس جگہ سے ترقی پسند تحریک کا عملی آغاز ہوا، ترقی پسند تحریک نے، جس میں اس دور کے تقریباً تمام نامور اہل قلم شامل تھے، زندگی سے ادب کو ہم آہنگ کرنے پر زور دیا، وقت کے ساتھ ساتھ ادیبوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور نوجوان اور سینئر ادیب انجمن کی نشستوں میں شریک ہونے لگے۔

''ترقی پسند تحریک'' کا ایک اہم رخ یہ ہے کہ اس کے زیرِ اثر تعلیم یافتہ خواتین میں ذہنی

Scanned by CamScanner

اور فکری آزادی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ پہلے وہ اپنے اصل نام کے ساتھ رسائل میں اپنی تخلیقات شائع کرانے کی ہمت نہ رکھتی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء تک بحیثیت افسانہ نگار یا شاعر خواتین کی تعداد بہت کم ہے۔ بیشتر خواتین ز۔خ۔ش اور بنت نذر الباقر (نذر سجاد) کی طرح اپنے نام پر ایک طرح کا پردہ ڈالے ہوئے تھیں۔ ترقی پسند تحریک کے قیام کے بعد سے یہ حجاب اٹھ گیا اور خواتین جس طرح آزادی کی تحریک میں مردوں کے ساتھ شریک ہوگئی تھیں، ادب کی تحریکوں میں شامل ہوگئیں اور نہ صرف یہ کہ شامل ہوگئیں بلکہ بعض نے اس ادبی تحریک کی تاسیس و توسیع میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کی مثال میں ڈاکٹر رشید جہاں کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں ۱۹۰۵ء میں علیگڑھ کی مشہور شخصیت شیخ عبداللہ کے گھر پیدا ہوئیں۔ یہ وہی شیخ عبداللہ ہیں جنہوں نے تعلیم نسواں کے سلسلے میں ''خاتون'' رسالہ جاری کیا اور علی گڑھ میں گرلز اسکول قائم کیا تھا۔ رشید جہاں نے اس اسکول میں تعلیم پائی پھر الہ آباد تھوبرن کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج دہلی سے ڈاکٹری کی ڈگری لی۔ ۱۹۳۴ء میں ان کی شادی محمود الظفر سے ہوئی [۶۸]۔ محمود الظفر کی ایم اے او کالج امرتسر کی ملازمت کے دوران میں رشید جہاں کی ملاقات فیض اور تاثیر وغیرہ سے ہوئی۔ فیض نے کئی جگہ تحریری طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کو ترقی پسند تحریک کی طرف متوجہ کرنے والے رشید جہاں اور محمود الظفر تھے۔ سبط حسن مرحوم کہتے ہیں کہ

> ''میں سمجھتا ہوں کہ رشیدہ آپا کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ
> وہ اتنے بڑے شاعر کو اس تحریک کی طرف لے آئیں جو
> بعد میں ہماری تحریک کی آبرو بن کر ابھرا۔'' [۶۹]

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء تک کا عرصہ رشید جہاں نے دہرہ دون میں گزارا۔ اس عرصے میں وہ سرگرم سیاسی کارکن کی حیثیت سے سامنے آئیں خصوصاً ۱۹۴۰ء میں محمود الظفر کی دیگر کمیونسٹ رہنماؤں کے ساتھ گرفتاری کے بعد رشید جہاں نے گرفتار شدگان کی بیبیوں کے ساتھ مل کر

Scanned by CamScanner

کامیاب مہم چلائی۔ اسی عرصے میں انہوں نے ایک سیاسی ماہنامے ''چنگاری'' کی ذمہ داری بھی لے لی[۷۰]۔۱۹۴۲ء میں محمود الظفر اور رشید جہاں لکھنو آ گئے جہاں رشید جہاں نے اپنی پریکٹس کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کا کام بھی جاری رکھا۔ ۱۹۴۹ء میں ریلوے ہڑتال کرانے کی پاداش مین ان کو تین مہینے کی قید کی سزا بھگتنی پڑی جیل میں مسلسل محنت، بھوک اور پھر ۱۴ دن کی بھوک ہڑتال کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ رہائی کے بعد ۱۹۵۰ء میں کینسر کی بیماری کی تشخیص ہوگئی۔۱۹۵۲ء میں وہ علاج کے لئے ماسکو گئیں جہاں تین ہفتے بعد ان کا انتقال ہوگیا اور انہیں ماسکو میں ہی کریملن کی دیوار کے سائے میں دفن کیا گیا۔[۷۱]

ڈاکٹر رشید جہاں تخلیقی حوالہ سے افسانہ نگاری، ڈرامہ نویسی، صحافت اور مضمون نویسی سے وابستہ رہیں لیکن ان کی شناخت عموماً افسانے اور ڈرامے خصوصاً ''انگارے'' میں شامل ان کی دو تخلیقات دلی کی سیر (افسانہ) اور پردے کے پیچھے (ڈرامہ) کے حوالے سے ہوتی ہے ۱۹۳۷ء میں ان کی پہلی کتاب ''عورت اور دوسرے افسانے'' شائع ہوئی۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''شعلہ جوالہ'' نعیم خان نے مرتب کیا رشید جہاں کے دستیاب ڈراموں کی کل تعداد نو ہے۔[۷۲]

اپنی پیش رو افسانہ نگار خواتین کی طرح رشید جہاں کے انسانوں کا بنیادی موضوع عورت ہی ہے۔ ان سے پہلے صغریٰ ہمایوں اور نذر سجاد وغیرہ کے افسانوں میں عورت کی اصلاح کا پہلو نمایاں رہا۔ حجاب امتیاز اگرچہ اپنے ہمعصروں سے قدرے مختلف اور منفرد رومانوی اسلوب لے کر سامنے آئیں پھر بھی ان کا اور ان کی ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں کا عصری شعور محدود تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے افسانوں میں عورت کے دنیا محدود ہی رہی اور عورت اس محدود دنیا سے مطمئن تھی۔ اس کے برعکس رشید جہاں کے ہاں عورت پہلی مرتبہ بحیثیت ایک انسان سامنے آتی ہے اور اپنے انسانی حقوق پر اصرار کرتی ہے۔ وہ عورت کی غیر معمولی مظلومی اور مجبوری کا تذکرہ ہی نہیں کرتیں بلکہ اس کے منفی پہلوؤں کو بھی بڑی سچائی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں کہ۔

Scanned by CamScanner

''رشید جہاں جیسی بے دھڑک بے محابا اور نڈر تھیں ان کے افسانے اتنے بے دھڑک بے محابا اور نڈر نہ ہو سکے لیکن پہلی بار ان کے یہاں عورت اپنے انسانی حق پر اصرار کرتی نظر آتی ہے۔ آخر اس کی بھی اپنی ایک شخصیت، ایک زندگی ہے اور اسے حق حاصل ہے کہ اس حق کو برت سکے یہ حق یہ انسانی روپ جنسوں کے درمیان منافرت سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس استحصالی نظام کے ختم کرنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے جس نے عورتوں کو ..... اور ان کے ساتھ دوسرے متعدد طبقوں کو غلام بنا رکھا ہے''۔[۷۳]

رشید جہاں کے افسانوں میں عورت اپنے شدید احساس جبر کے ساتھ نظر آئی۔ ایک ترقی پسند نقطہ نظر سے رشید جہاں نے زندگی کے دیگر مسائل کے ساتھ عورت کے انسانی حقوق، انسانی توہمات، سماجی Stigma چادر اور چار دیواری کے غلط تفہیم جیسے موضوعات پر کہانیاں لکھیں۔ ان کی یہ کہانیاں ممکن ہے مروجہ معیار کے مطابق اعلیٰ ادبی مقام پر فائز نہ ہوں لیکن انہوں نے جنوبی ایشیا کی عورت کا ذہن بدل ڈالا۔ باجرہ بیگم لکھتی ہیں۔

''عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، صدیقہ بیگم اور نہ جانے کتنی مصنف تھیں جنہوں نے رشید جہاں کے افسانوں، رشید جہاں کی زندگی اور مسحور کن شخصیت کو مشعل راہ سمجھا''[۷۴]

خود عصمت چغتائی جیسی نڈر خاتون اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ صاف گوئی اور بے باکی کا سبق انہوں نے رشید جہاں سے سیکھا واقعہ بھی یہی ہے کہ رشید جہاں دو حوالوں سے اردو میں نسائیت کی تحریک کا اہم سنگ میل ہیں ایک تو ان کے افسانوں میں پہلی بار نسائی بغاوت کی آواز سنائی دی دوسرے وہ خود اپنی ذات میں آزادیِ نسواں اور آزادیِ اظہار کی علامت بن گئیں ۔علی احمد فاطمی درست لکھتے ہیں کہ۔

Scanned by CamScanner

''آج جو نسائیت یا تانیثیت کی تحریک سر اٹھا رہی ہے اس میں بھی
رشید جہاں کا خون پسینہ کام کر رہا ہے''۔[۷۵]

عصمت چغتائی، رشید جہاں کی طرح باضابطہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہیں۔ دوسرے بحیثیت خاتون ناول نگار بھی وہ اپنی حیثیت میں منفرد اور ممتاز ہیں تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی کے درمیان ادبی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کے پس منظر میں عصمت چغتائی اپنی ہم عصر خواتین قلم کاروں کو صاف گوئی اور بے باکی کا راستہ دکھاتی ہیں اور خود اپنے افسانوں اور ناولوں میں ایسی عورتوں کے کردار پیش کرتی ہیں جو روایت شکن ہیں اور نئی فضا میں سانس لینے کے خواہش مند ہیں۔

عصمت چغتائی نے افسانوی ادب میں سماجی بغاوت کے اس رجحان کو آگے بڑھایا جس کا آغاز رشید جہاں نے کیا تھا انکے ہاں افسانے یا ناول کا مرکزی کردار عموماً عورت ہے۔" ضدی"، ''ٹیڑھی لکیر"، ''معصومہ"، "سودائی" ان سب ناولوں میں عورتوں کے کردار کی الگ الگ نفسیاتی شخصیت ہے جس کے پیچھے لاتعداد سماجی، معاشرتی، معاشی، مذہبی اور تاریخی عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ ٹیڑھی لکیر کی سمن ایسی عورت کی نمائندگی کرتی ہے جو بچپن سے اس توجہ اور محبت سے محروم رہتی ہے جو اس کا حق ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سماج اور اقدار سے بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ قاری اس بغاوت کو پسند کرے یا نہ کرے وہ اس ہمت اور حوصلے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جو سمن کے کردار کا بنیادی جزو ہے۔ اسی طرح معصومہ کے کردار کی عورت بھی ایسے سماج کی پیداوار ہے جس کا اخلاقی ڈھانچہ تباہ ہو چکا ہے اور نام نہاد تہذیب دم توڑ چکی ہے۔

اس بات سے قطع نظر کہ عصمت چغتائی کے ہاں عورت کے کردار کا فنی معیار کیا ہے اور عصمت کی کردار نگاری کس نوع کی ہے۔ اس جگہ صرف اس جانب اشارہ مقصود ہے کہ عصمت کے ہاں، عورت کی نفسیاتی پیچیدگیاں اور اس کے پیچھے کارفرما عوامل واضح طور پر موجود ہیں اور عورت کے باطن کے ایسے گوشے عصمت کے قلم سے اجاگر بلکہ عریاں ہوتے ہیں جن کی طرف

Scanned by CamScanner

اشارہ کرنے سے بھی لوگ عموماً احتراز کرتے ہیں۔

عصمت چغتائی کی عورت، جرات مند، باغی اور جارحیت پسند ہی نہیں عصمت کے نظریات کی علم بردار بھی ہے۔ عصمت کے ناول، افسانے خاکے اس کے علاوہ ان کے مضامین اور انٹرویو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عورت میں زبردست خود اعتمادی کی خواہش مند ہیں۔ وہ پردے کی سخت مخالف نہیں بلکہ بعض اوقات عورت کی فطری شرم و حیا کی بھی مخالفت کرتی نظر آتی ہیں کیوں یہ شرم و حیا عورت کی عملی زندگی میں رکاوٹ بنتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ معاشرہ جتنی زیادہ سختی سے عورت پر پابندیاں عائد کرتا ہے، عصمت اس سے کہیں زیادہ قوت سے ان پابندیوں کو توڑنے کی حمایت کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تمام اخلاقی ضابطے بھی مسمار کر دیتی ہیں اور انکی ادبی شخصیت کا یہ پہلو ہے جو انہیں ایک طرف حلقہ عام و خاص میں محبوب بھی بنواتا ہے دوسری طرف انہیں معطون بھی کرواتا ہے۔

یہ تو نثر نگار خواتین کا ذکر تھا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر خواتین شعراء بھی بے جھجک ادبی رسائل میں اپنی تخلیقات شائع کرانے لگیں اور انجمن کی تخلیقات کے منتخبات میں ان کو ان کے نام اور کام کو بھی جگہ ملنے لگی۔ اس کی ایک واضح مثال آج کی صف اول کی شاعرہ ادا جعفری ہیں۔ ادا جعفری کی ایک نظم انجمن ترقی پسند مصنفین کے اس انتخاب میں شامل ہے جو "نئی امنگیں" کے عنوان سے ۱۹۴۴ء میں کتاب گھر دہلی سے شائع ہوا تھا۔ جسے انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکریٹری پروشوتم سنگھ سیٹھی نے مرتب کیا تھا۔ ادا جعفری کی عمر اسوقت پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن ان کی ایک بہت خوبصورت نظم اس مجموعے میں شامل ہے۔ اس کا عنوان ہے "یہ جیون یونہی بیتے گا"۔ گیارہ اشعار کی یہ نظم ادا جعفری کی شاعری اور ان کے ارتقائے ذہنی کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس مجموعے میں جوش ملیح آبادی، شاد عارفی، جانثار اختر، اختر الایمان، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، معین احسن جذبی، یوسف ظفر اور الطاف مشہدی وغیرہ جیسے نامور شاعروں کی منظومات بھی شامل ہیں۔

Scanned by CamScanner

یہ تو ترقی پسند خواتین کی چند مثالیں ہیں جو اس تحریک کے ابتدائی دنوں میں سامنے آئیں ان کے بعد خواتین کے ناموں کی ایک طویل فہرست ہے جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہیں اس کے ساتھ ایک فیمنسٹ رویہ بھی رکھتی ہیں۔

خواتین سے قطع نظر، ترقی پسند تحریک سے وابستہ مرد ادیبوں نے بھی عورت کے روایتی کردار کو رد کیا۔ اس حوالے سے سب سے نمایاں نام تو سعادت حسن منٹو کا ہے۔ منٹو نے عورت اور اس کی نفسیات کے رموز ہی نہیں کھولے بلکہ وہ اپنی کہانیوں میں مرد اور عورت کے اسٹیریو ٹائپ کردار کو سختی سے رد کر دیتے ہیں۔ منٹو کے علاوہ پریم چند، سجاد ظہیر، احمد علی جیسے ادیب جو ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھنے والے تھے، وہ بھی عورت کے استحصال کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے۔

شاعری کے حوالے سے بات کی جائے تو فیض کا یہ شعر دیکھیے کہ

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوے دار چلے

اور کیفی اعظمی عورت کے لیے کہتے ہیں۔

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں، بس اشک افشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے، دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اک چیز، جوانی ہی نہیں
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

اور مجاز کا تو مشہور زمانہ شعر ہے کہ

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

Scanned by CamScanner

مختصر یہ کہ ترقی پسند تحریک کی صورت میں جاگیردارانہ طرز حیات اور دولت مندوں کے ہاتھوں مزدوروں اور کم زوروں کی محنت کے جبری استحصال کے خلاف ایک طاقتور آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز خواتین کے مزاج اور نفسیات کے عین مطابق تھی۔ اول اس وجہ سے کہ وہ خود اپنے آپ کو مظلوم و مجبور سمجھتی تھیں اور ان کا خیال تھا اور آج بھی ہے کہ مشرق کے پدرانہ معاشرے نے خواتین کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اس تنگ نظری اور دقیانوسیت سے بھی بیزار تھیں جو مذہب کے نام پر عام کی گئی تھی اور جس میں نہ صرف یہ کہ پردے کی پابندی کو لازمی قرار دیا گیا تھا بلکہ جو عورتوں کی اعلیٰ تعلیم خصوصاً مغربی تعلیم کے حصول میں رکاوٹ بن رہی تھی۔

کسب معاش کے دروازے بھی عموماً خواتین پر بند تھے، طب انجینئرنگ، نفسیات بعض سائنسی و معاشرتی علوم کی تعلیم کو بھی ان کے حق میں مضر خیال کیا جاتا تھا۔ مخلوط تعلیم یعنی طلباء طالبات کو ساتھ ساتھ کلاس روم میں بیٹھنے اور تبادلہ خیال کی اجازت بھی مشکل سے ملتی تھی۔ خواتین میں یہ احساس بھی پایا جاتا تھا کہ عورت خواہ کتنی ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو اس معاشرے میں وہ محکوم او رمجبور ہی رکھی جائے گی۔ مرد خواتین کے ساتھ کبھی انصاف نہ کر سکیں گے، بلکہ انہیں اپنا زر خرید غلام بنا کر رکھیں گے۔ جب چاہیں گے طلاق دیں گے اور جب چاہیں گھر سے جبراً نکال دیں گے۔ اس طرح کی اور نہ جانے کتنی سماجی اور معاشی ناہمواریاں تھیں جنہوں نے خواتین میں مردانہ معاشرے کے خلاف ایک طرح کا احتجاجی رجحان پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ انہیں جب آزادی ملی تو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ انہوں نے خواتین کے مسائل کو ہی موضوع بنایا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا حق ادا کیا۔

Scanned by CamScanner

دیگر ادبی رجحانات، تحاریک اور خواتین:

مذکورہ بالا حالات نے خواتین کو ان نئے افکار کو بھی بے باکانہ قبول کرنے پر راغب کیا جو برصغیر کے مسلم معاشرے میں ترقی پسند تحریک کے فوراً بعد جگہ پا گئے تھے۔ فرائڈ کا یہ نظریہ کہ تخلیق یا کسی بڑے ذہنی کارنامے کا اصل محرک، جنسی جذبہ ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ہاتھوں اتنی تیزی سے آگے بڑھا کہ وہ موضوعات جو اس سے پہلے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے اور جنہیں ہاتھ لگاتے ہوئے مرد بھی ہچکچاتے تھے خواتین کے ہاں دلیرانہ طور پر استعمال ہونے لگے عصمت چغتائی اس کی نمایاں ترین مثال ہیں جنہوں نے جنس کے پیدا کردہ مسائل اور دوسرے سماجی وموضوعات کو پوری توجہ اور بے باکی سے اپنایا اس سلسلے میں کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کے نام لیے جاسکتے ہیں ناول اور افسانے میں ان خواتین کی تعداد بہت زیادہ ہے پھر یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے فنی معیار کو بھی اتنا بلند رکھا کہ وہ اردو فکشن و ادب پر تقریباً چھا گئیں ان میں نمایاں ترین نام عصمت چغتائی قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ، رضیہ فصیح احمد، جیلانی بانو، جمیلہ ہاشمی الطاف فاطمہ، فرخندہ لودھی، سائرہ ہاشمی، اختر جمال وغیرہ کے ہیں ان سب کے ہاں فرائڈ کے نظریات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ فرائڈ اور مارکس کے خیالات سے پیدا شدہ مسائل سے قطع نظر جب ترقی پسند تحریک کے ہاتھوں حقیقت نگاری کا زور بڑھا تو اسکے ردعمل میں رمزیاتی وعلامتی اظہار کا زاویہ نظر ادب میں جگہ پا گیا۔ خواتین نے بھی اس میں بھرپور حصہ لیا۔ جدیدیت کی تحریک جو ایک طرح سے ترقی پسند تحریک کی فلسفیانہ حقیقت نگاری کا جواب تھی، اس میں بھی خواتین شعرا اور افسانہ نگار، مردوں کے دوش بدوش نظر آنے لگیں۔ جیمز جوائس کے زیر اثر شعور کی

Scanned by CamScanner

رد کی جو تحریک بروئے کار آئی اس کی نمائندگی کا حق بھی خواتین ہی نے ادا کیا اور اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر کا نام برصغیر کی حدود سے آگے بڑھ کر آفاقی سطح پر پہنچ گیا اس جگہ پاکستان میں مزاحمتی ادب کی تحریک کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۵ء کے درمیان پاکستانی شاعروں اور ادیبوں نے مزاحمتی ادب تخلیق ہی نہیں کیا، عملی سیاسی مزاحمت میں بھی حصہ لیا۔ ان میں حبیب جالب اور احمد فراز کے ساتھ فہمیدہ ریاض، کشور ناہید کے نام سرفہرست ہیں۔ یہ دونوں ہی آج کی اہم فیمنسٹ شاعرہ بھی ہیں اور نقاد بھی ہیں۔

غرض یہ کہ بیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر آج تک اردو ادب میں جتنی تحریکیں یا طاقتور رجحانات سامنے آئے ہیں ان سب میں خواتین نے پوری دلچسپی لی۔ ان کی تعداد بظاہر کم نظر آتی ہے۔ لیکن اگر اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ خواتین کو بہت دیر سے اعلیٰ تعلیم کے ساتھ لکھنے پڑھنے کی اجازت ملی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خصوصاً ترقی یافتہ ممالک کی تعلیم یافتہ خواتین کا تناسب آج بھی مردوں کے مقابلے میں کم ہے تو پھر کہنا پڑتا ہے کہ اس عورتیں کسی طرح بھی علمی و ادبی کاموں میں پیچھے نہیں رہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی کام کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک طاقتور فیمنسٹ رجحان کی ابتدا ہو چکی ہے۔

Scanned by CamScanner

باب دوم

حواشی وحوالہ جات

[۱] سید شرافت حسین شرافت، عورت، مذہب اور حکومت مطبوعہ نسیم بک ڈپو، لاہور۔۱۵

[۲] سبط حسن (۱۹۷۵ء)، ۲۰۰۲ء، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، ص ۶۶

[۳] سبط حسن (۱۹۷۵ء)، ۲۰۰۲ء، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال۔ص ۷۲

[۴] مبارک علی ڈاکٹر (۱۹۹۶ء)، تاریخ اور عورت، فکشن ہاؤس، لاہور۔ص ۴۸

[۵] ڈاکٹر مہر عبدالحق (۱۹۹۳ء)، ہندو صنمیات، بیکن ملتان، ص ۳۱۲

[۶] ایضاً

[۷] R.Khanum(2002),Muslim Feminism And Feminist Movement -Central Asia Edited By Abida Samiuddin, Global Vision House.

[۸] فہمیدہ ریاض کے یہ لیکچر ڈاکٹر ڈاکٹر فاطمہ حسن کی مرتبہ کتاب ''فیمنزم اور ہم'' میں شامل ہیں۔ یہ لیکچر ۱۹۹۳ء میں برطانیہ میں دیے گئے۔ مزید معلومات کے لئے دیکھئے ''فیمنزم اور ہم''۔ مرتبہ ڈاکٹر فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، کراچی

[۹] unveiling the issues edited by Nighat Saeed Khan published by ASR publication .Lahore

[۱۰] فصیح الدین رنج کا تذکرہ ''بہارستانِ ناز'' ۱۸۶۴ء میں مطبع دارالعلوم میرٹھ سے شائع ہوا۔ اس کے بعد مولف کی زندگی میں ہی ۱۸۶۹ء اور ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں یہ مجلس ترقی ادب لاہور کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا اور اسے خلیل الرحمٰن داؤدی نے مرتب کیا۔ ''بہارستان ناز کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اردو شاعرات کا یہ پہلا تذکرہ ہے۔ بہارستان کی پہلی اشاعت میں صرف ستر شاعرات کا تذکرہ ہے۔ آخر تک یہ تعداد ۱۷۴ تک پہنچ گی۔

Scanned by CamScanner

[۱۱] ''شمیم سخن'' مرتبہ عبدالحئی صفا بدایونی کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں مرد شعرا کا کلام و حال درج ہے اور دوسرا حصہ خواتین شعراء کے بارے میں ہے۔

[۱۲] درگاہ پرشاد نادر نے ''تذکرۃ النساء نادری'' کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی۔ اس کتاب کا تاریخی نام ''مرات خیالی'' تھا۔ مرات خیالی کے دو حصے ہیں، ''گلشن ناز اور چمن انداز''۔ گلشن ناز (۱۸۷۶ء) فارسی شاعرات کا تذکرہ ہے اور چمن انداز (۱۸۷۸ء) اردو شاعرات کا تذکرہ ہے، اس میں کل ۱۴۴ شاعرات کا تذکرہ ہے۔

ان تینوں تذکروں کے تفصیلی جائزے کے لئے دیکھیے ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری''، ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ مطبوعہ لاہور (۱۹۷۲ء)

[۱۳] سرسید احمد خان (۱۸۵۷ء) ۱۹۸۶ء، اسباب بغاوت ہند (فصل اول)، اردو اکیڈمی سندھ۔ ص ۱۲۵

[۱۴] محمد امین زبیری (۱۹۵۶ء)، مسلم خواتین کی تعلیم۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ کراچی۔ ص ۹۵۔۹۶

[۱۵] مراۃ العروس (۱۸۷۰)

[۱۶] بنات النعش (۱۸۷۲)۔ ان دونوں ناولوں میں نذیر احمد نے عورتوں کی باقاعدہ تعلیم کا تصور پیش کیا۔

[۱۷] فسانہ آزاد (۱۸۸۰)۔ میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

[۱۸] بدر النساء کی مصیبت (۱۹۰۱) شرر نے اس ناول میں عورتوں کی جہالت اور پردے کی سختی کے خلاف آواز بلند کی

[۱۹] ۱۸۷۰ء میں حالی نے ایجوکیشنل کانفرنس میں نظم ''چپ کی داد'' پڑھی۔ اس نظم میں مسلمان عورتوں کی تعلیمی حالت کا بڑی دردمندی سے ذکر کیا گیا تھا۔ عورتوں کی تعلیم اور ترقی میں اس نظم نے اسی نوعیت کا کردار ادا کیا جو ''مسدس حالی'' نے قوم کی ترقی کے لئے کیا تھا۔ اس نظم نے ذہنوں کو جھنجوڑ ڈالا۔ یہ حد درجہ مقبول ہوئی اور لاتعداد مرتبہ شائع ہوئی۔ اپنے عہد میں یہ ایک نوع کی فیمنسٹ نظم ہی کہی جا سکتی ہے۔

[۲۰] محمد امین زبیری (۱۹۵۶ء)، مسلم خواتین کی تعلیم، ایجوکیشنل کانفرنس۔ کراچی

[۲۱] ڈاکٹر سیمیں ثمر فضل (۱۹۹۱) ہندوستانی مسلم خواتین کی تعلیمی ترقی، دہلی۔ ص ۱۱۸

[۲۲] نصیر احمد ہاشمی (۱۹۵۲ء) ۱۹۸۵ء۔ دکن میں اردو، ترقی اردو بیورو، دہلی ص۔ ۶۶

Scanned by CamScanner

[۲۳]ڈاکٹر سیمیں شمر فضل (۱۹۹۱ء)، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ، دہلی۔ص ۱۱۹۔

[۲۴]مولانا امداد صابری (۱۹۷۴ء)، تاریخ صحافت اردو (جلد ۵) دہلی۔ص ۴۷۴

[۲۵]رازق الخیری (۱۹۶۴ء) ماہنامہ عصمت کراچی (سالگرہ نمبر) جولائی اگست، ص ۱۴۱

[۲۶]ڈاکٹر عصمت جمیل (۲۰۰۱ء)، اردو افسانہ اور عورت، شعبہ اردو: زکریا یونیورسٹی، ملتان۔ص ۹۲

بحوالہ

The Emergence of Feminism Among Indian Muslim Women,(1920),Azra Asghar ,London

[۲۸]ایضاً

[۲۹]ایضاً

[۳۰]وقار عظیم (۱۹۶۸ء)، صحیفہ لاہور۔اپریل ۶۸ء

[۳۱]قرۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ہے (حصہ اول)، لاہور۔ص ۱۶۲

[۳۲]ایضاً

[۳۳]رازق الخیری (۱۹۶۷ء) ماہنامہ عصمت، کراچی بابت دسمبر ۶۷ء

[۳۴]ڈاکٹر نیلم فرزانہ (۱۹۹۲ء) اردو کی اہم ناول نگار خواتین، علیگڑھ

[۳۵]نصیر الدین ہاشمی (۱۹۵۲ء) دکن میں اردو، لاہور۔ ص ۸۱۶

[۳۶]ایضاً

[۳۷]ڈاکٹر فرمان فتحپوری (۱۹۸۲ء)، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔ص ۱۴۲

[۳۸]ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین (۱۹۹۱) ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، مشمولہ خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ۔ص ۱۵۹۔۱۵۱

[۳۹]ایضاً

[۴۰]نعیمہ بیگم شروانیہ (۱۹۵۴ء) ''حیاتِ ز۔خ۔ش''، حیدرآباد۔دکن

[۴۱]زاہدہ خاتون شروانیہ (۱۹۵۴ء) مرتبہ نعیمہ بیگم شروانیہ، لاہور ۱۹۴۱

[۴۲]ایضاً

Scanned by CamScanner

[۴۳] بحوالہ "حیات ز۔خ۔ش" مرتبہ انیسہ بیگم شروانیہ، حیدر آباد، دکن ۱۹۵۴ء

[۴۴] ایضاً

[۴۵] ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین (۱۹۹۱ء) ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، مشمولہ خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ ص ۱۸۸۔۱۸۷

[۴۶] ماہنامہ "عصمت"، اپریل ۱۹۲۱ء

[۴۷] تفصیل کے لئے دیکھئے

ڈاکٹر فرمان فتحپوری، "قمر زمانی بیگم"، مطبوعہ ادارہ مصنفین لاہور، ۱۹۷۱ء

[۴۸] "عورت اور فنونِ لطیفہ" مرتبہ نیاز فتحپوری حلقہ نیاز و نگار کراچی، ۱۹۹۳ء

[۴۹] ایضاً

[۵۰] احتشام حسین، نگار۔ نیاز نمبر (حصہ اول) اپریل ۱۹۶۳ء

[۵۱] "تاریخ علیگڑھ تحریک"، آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس کراچی ۸۱۔۱۹۸۰ء ص ۸۷

[۵۲] عبدالقادر سروری (۱۹۳۴ء)، حیدر آباد کی تعلیمی ترقی گزشتہ ربع صدی میں، حیدر آباد، دکن۔ ص ۸۷

[۵۳] عبدالشکور (۱۹۴۶ء) حسرت موہانی، آگرہ، ص ۱۰۰

[۵۴] ڈاکٹر خلیق انجم (۱۹۹۴ء) حسرت موہانی، دہلی۔ ص ۱۰۳

[۵۵] ڈاکٹر خلیق انجم (۱۹۹۴ء)، حسرت موہانی، دہلی۔ ص ۱۱۹

[۵۶] عتیق احمد صدیقی (۱۹۸۱ء) بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط دہلی۔ ص ۲۹

[۵۷] رابعہ بیگم (۱۹۵۱ء) اردو ادب۔ حسرت نمبر علیگڑھ۔ ص ۹۸

[۵۸] سید سلیمان ندوی (۱۹۵۲ء)۔ نگار، حسرت نمبر لکھنؤ

[۵۹] محمد علی جوہر (۱۹۲۴ء) کامریڈ۔ بحوالہ عابدہ سمیع الدین۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، مطبوعہ پٹنہ (۱۹۹۱ء)

[۶۰] محمد علی جوہر "نقوش آپ بیتی نمبر" (حصہ اول) لاہور۔ (۱۹۶۴ء)

[۶۱] پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو مرتبہ ہاشمی فرید آبادی۔ کراچی۔ (۱۹۵۳ء)

[۶۲] مشمولہ اختر حسین رائے پوری (۱۹۴۴ء) ادب اور انقلاب۔ بمبئی

Scanned by CamScanner

[۶۳] مشمولہ مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی۔ علیگڑھ۔
[۶۴] احمد علی، ترقی پسند تحریک۔ سیپ کراچی۔
[۶۵] سجاد ظہیر (۱۹۷۶) روشنائی، کراچی۔ ص۔ ۲۰
[۶۶] افکار۔ کراچی، مارچ ۱۹۷۴ء۔ ص ۴۳
[۶۷] احمد علی۔ ترقی پسند تحریک۔ سیپ کراچی۔
[۶۸] ڈاکٹر شاہدہ بانو (۱۹۹۰ء)۔ ڈاکٹر رشید جہاں حیات اور کارنامے۔ لکھنؤ ص ۸۲
[۶۹] سبط حسن، انٹرویو، اندازے۔ الہٰ باد، شمارہ ۲۰
[۷۰] ڈاکٹر شاہدہ بانو (۱۹۹۰ء) ڈاکٹر رشید جہاں۔ حیات اور کارنامے لکھنو۔ ص ۸۵
[۷۱] ایضاً۔ ص ۲۵۲
[۷۲] ایضاً۔ ص ۲۵۳
[۷۳] ڈاکٹر محمد حسن۔ عصری ادب خواتین نمبر دہلی۔ ص ۱۸
[۷۴] بحوالہ علی احمد فاطمی (۲۰۰۶) ترقی پسند تحریک ۔ سفر در سفر۔ الہٰ باد۔ ص ۷۸۔ ۷۹
[۷۵] ایضاً

Scanned by CamScanner

باب سوم

اردو کا نسائی/ Feminist دبستان تنقید

- نسائی تنقید (تعریف، روایت)
- اردو ادب کے اہم تنقیدی دبستان
- نسائی دبستان
  - ۔رجحانات
  - ۔اہم نسائی نقاد
  - ۔مسائل و مباحث
- حواشی و حوالہ جات

Scanned by CamScanner

اردو کا نسائی دبستان تنقید

نسائی تنقید (تعریف، روایت)

فیمینزم / نسائیت کا اوّلین اظہار ادب کے ذریعے ہوا۔ ابتدا میں، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، مغرب کی فیمنسٹ تحریک کی دو جہتیں رہیں، ایک عملی اور دوسری نظریاتی۔ برطانوی یا امریکی فیمنزم کے مقابلے میں فرانسیسی فیمنزم کی تحریک نظریاتی اور ادبی انداز لئے نظر آتی ہے۔ خصوصاً ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء کے درمیانی عرصے میں فرانس میں فیمنسٹ ادیبوں کا ایک گروہ سامنے آیا، جنہیں فیمنزم کی عملی تحریک سے زیادہ سروکار نہیں تھا۔ ان کے مباحث جزباتی اور علامتی انداز رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے نسائی اور بدونی ساخت کے رشتے پر گفتگو کی اور دیگر کئی فلسفیانہ نکات چھیڑے۔[۱] دوسری طرف انگریزی فیمنزم کا رخ اگرچہ سیاسی تھا لیکن ادیب اس خطے میں بھی فیمنزم کے ہراول دستے میں رہے۔ اور یوں ادب میں ایک مکتبہ فکر نظر آنے لگا، جیسے نسائی مکتبہ فکر (feminist school of thought) کہا جا سکتا ہے۔ فیمنسٹ مکتبہ فکر نے ادب کا مطالعہ نسائی نقطہ نظر سے کیا اور یہیں سے نسائی تنقید (feminist criticism) کی بنیاد پڑی۔ گویا نسائی تنقید کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے کہ

> ''نسائی ادبی تنقید وہ ادبی تنقید ہے جو نسائیت کے نظریہ سے روشنی حاصل کرے''۔

ایک انگریزی لغت میں ادبی نسائی تنقید کی تعریف اس طرح درج ہے

"Feminist literary criticism is literary criticism informed by feminist

Scanned by CamScanner

theoryor by the politics of feminism,more brocadly".[2]

جوڈتھ فیٹر لے، معروف نسائی تنقید نگار لکھتی ہیں

'نسائی تنقید ایک سیاسی عمل ہے جس کا مقصد محض دنیا کی تفہیم کرنا ہی
نہیں، بلکہ دنیا کو تبدیل کرنا بھی ہے۔ قاری کے شعور کی اور قاری اور متن
کے باہمی رشتے کی تبدیلی کے ذریعے'' [۳]

گویا نسائی نقاد کا بنیادی مقصد قاری کے ذہن کو تبدیل کرنا، اور متن سے قاری کے رشتے کو تبدیل کرنا ہے۔ اس تبدیلی کے ذریعے ہی دنیا کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

مغرب میں نسائی تنقید کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو بعض لکھنے والے نسائی تنقید کا رشتہ افلاطون کی "Republic" سے جوڑتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ افلاطون پہلا فیمنسٹ ادیب ہے۔ کیونکہ اس نے عورت کی حکومت کی حمایت کی ہے اس کا خیال ہے کہ عورت کی حکمرانی کیلئے تربیت کرنا چاہیے۔ لیکن افلاطون کی مثال تاریخ میں ایک استثنا ہے۔

مغرب میں نسائی تنقید کی پہلی اہم کتاب سائن ڈی بووا کی "The second sex" ہے۔ جس نے نسائیت کا رشتہ وجودیت سے جوڑا۔ اس کے بعد نسائی تنقید نے تحلیل نفسی اور مارکسزم کے بعد جدیدیت اور ساختیات سے بھی اپنا رشتہ قائم کیا۔ خصوصاً مابعد جدیدیت اپروچ نے نسائی تنقید کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ مابعد جدیدیت نے نسائی نقاد کی توجہ ساختیات کی طرف مبذول کرائی اور شعر و ادب کی رد تشکیل کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جنس کے تصور کو مستحکم کرنے کا ایک بڑا ذریعہ زبان ہے۔

مغرب میں نسائی تنقید کے اس ارتقا کو امواج کے نظریے (wave concept) کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے تو پہلی موج (First wave) میں نسائی تنقید متعارف ہو رہی ہے۔ اس دور میں نسائی تنقید کا موضوع بیشتر سماج اور اس میں عورت کی محکومیت ہے۔ [۴] دوسری موج (second wave) میں نسائی تنقید نے ادبی رنگ بھی اختیار کیا۔ وجودیت اور جدیدیت کے

Scanned by CamScanner

اثرات قبول کیے۔ اس دور کی ادبی نسائی تنقید کے موضوعات کے اعتبار سے دو رجحانات ہیں ایک یہ کہ ادب میں عورتوں کی پیشکش کا جائزہ لینا۔ دوسرے تاریخ میں عورتوں کے ناموں کی تلاش اور انہیں درست مقام دلانے کی کوشش کرنا۔[۵] تیسری موج (third wave) میں، جو آج تک جاری ہے۔ ساختیات اور پس ساختیات کی مدد سے ادب کی تفہیم اور رد تشکیل کی گئی[۶]۔ اس دور میں نسائیت سے متعلق نظریاتی مباحث اٹھائے گئے۔ نسائیت/فیمنزم کے ابہامات اور تضادات پر گفتگو کی گئی۔ فیمنزم کی مختلف شاخوں کی بات ہوئی۔ نسائیت کا رشتہ دیگر علوم اور نظریات سے دریافت کیا گیا۔ انفرادی نسائی آوازوں کی شناخت کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ آج نسائیت کا رشتہ سماجی علوم سے لے کر سائنسی مضامین تک، مذہب سے لے کر تجارت تک ہر شعبے سے جڑا نظر آتا ہے۔

wave concept پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس تصور میں نشیب و فراز کا تعین فیمنزم کی عملی اور سیاسی جدوجہد کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ یعنی جس دور میں نسائیت کی عملی اور سیاسی جدوجہد نے زور پکڑا اسے ''فراز'' قرار دے دیا گیا ہے اور جس دور میں عملی سطح پر ہلچل دکھائی نہیں دیتی، اس دور کو ''نشیب'' تصور کر لیا گیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جس عہد میں عملی سطح پر گہما گہمی نہیں دکھائی دیتی۔ اس عہد میں بھی نظریاتی سطح پر خاصہ کام ہوا ہے۔ Elaine Showaiter نے اپنی کتاب ''نئی نسائی تنقید'' The New Feminist Criticism میں مغرب میں ادبی نسائی تنقید کو تین مراحل میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ پہلا دور وہ ہے کہ جسے شوالٹر Feminist criticism کا نام دیتی ہے اس دور میں ادب اور تخلیقی عمل کے محرکات کا جائزہ فیمنسٹ نقطہ نظر سے لیا گیا۔

۲۔ دوسرے مرحلے کے لئے وہ Gynocriticism کی اصطلاح استعمال کرتی ہے۔ اس مرحلے پر عورت متن کی تعبیر اور تفہیم خود کرتی ہے۔ عورت کی تخلیقیت، اس کے تخلیقی عمل کے جذباتی، حیاتیاتی، سماجی، علمی اور نفسیاتی محرکات اور اسباب کا تعین، زبان اور اس کی نسائی

Scanned by CamScanner

خصوصیات کا مطالعہ اور عورتوں کی انفرادی اور اجتماعی ادبی کاموں کے ارتقا کا مطالعہ، عورت خود ہی اپنے نقطہ نظر سے، اپنے معیارات پر کرتی ہے۔

۳۔ تیسرا مرحلہ جسے شوآلٹر Gender theory کہتی ہے اس میں نظریاتی اور ادبی مباحث پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ تذکیر و تانیث سے متعلق تصورات ادب کو کس طرح متاثر کرتے ہیں اور ادب اور Gender کس طرح ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ اس تیسرے مرحلے پر نسائی تنقید کا موضوع بنتا ہے۔

شوآلٹر کی یہ تقسیم بھی نسائی تنقید کے ارتقاء کو پوری طرح گرفت میں لینے سے قاصر ہے، اور لگی بندھی، روایتی اور جامد تقسیم معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ادبی اور تخلیقی عمل کو ادوار میں تقسیم کرنا عملی طور پر ممکن ہوا کرتا ہے۔ ایک ہی عہد کے دو نقاد اپنی تنقید کے اعتبار سے دو الگ الگ ادوار کے نقاد قرار دیے جا سکتے ہیں۔ یا پھر ایک ہی نقاد کی دو تحریریں، دو علیحدہ ادوار کی نمائندہ ہو سکتی ہے۔

بہر حال مغرب میں آج نسائی تنقید بجائے خود ایک سماجی علم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کی جہات میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تاہم مغربی نسائیت، ایشیا، بالخصوص جنوبی ایشیا کی نسائیت کی تحریک یا فیمنزم سے متصل ہوتے ہوئے بھی کافی مختلف ہے۔ یوں اردو ادب کی نسائی تنقید بھی ایک علیحدہ شناخت اور صورت رکھتی ہے۔

اردو ادب کی نسائی تنقید پر بات کرنے سے پہلے اس پس منظر کو بھی سمجھ لینا ضروری ہے جس میں اردو تنقید نے پرورش پائی۔ اساتذہ کی اصلاح، مشاعروں کی داد، شعراء کے معرکوں اور تذکروں سے نکل کر تنقید نے حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری" میں پہلی مرتبہ اپنی شناخت قائم کی۔ یہ سرسید احمد خان کا عہد تھا۔

جدید اردو ادب کی ابتدا عہد سرسید سے ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرسید احمد خان نے سب سے پہلے اپنے عہد کی فکر کا رخ تبدیل کیا۔ انہوں نے لوگوں کو نئے خیالات کی طرف

Scanned by CamScanner

متوجہ کیا، سائنسی نقطہ نظر سے روشناس کیا اور عقلیت اور اجتماعیت کو ادب کا حصہ بنایا۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو سب سے پہلے محمد حسین آزاد نے لاہور کے لیکچروں میں جدید تنقیدی خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد آب حیات ۱۸۸۰ء میں سامنے آئی۔ ۱۸۹۳ء میں الطاف حسین، حالی کی ''مقدمہ شعروشاعری'' شائع ہوئی۔ حالی کی ''مقدمہ شعروشاعری'' ہی وہ کتاب ہے جس نے ادبی تنقید کو باضابطہ علم کی حیثیت دے دی۔ اس دور میں جنوبی ایشیا میں نئی اور پرانی تہذیب کی ایک کشمکش جاری تھی۔ ایک نیا معاشی اور صنعتی نظام اس خطے میں اپنے قدم جما رہا تھا۔ ''ادب، برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' کے نظریات کی کشمکش گرچہ بعد میں ابھر کر سامنے آئی مگر اس کی ابتدا حالی اور سرسید کے عہد سے ہی ہوگئی تھی۔ وقت کے ساتھ جہاں سرسید تحریک کا ردعمل واضح ہو کر سامنے آیا، وہاں مغربی ادب کے اثرات بھی اردو ادب پر نظر آئے۔ ادب کا زندگی سے تعلق اور مقصدیت کی اہمیت کا نظریہ سامنے آیا۔ جمالیاتی احساس اور سماجی اقدار کے مباحث چھیڑے گئے۔ اس دوران اگرچہ اردو تنقید کو ''اقلیدس کا خیالی نقطہ'' اور ''معشوق کی موہوم کمر'' سے بھی تعبیر کیا گیا مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے دعوے ایک انتہا پسندانہ نقطۂ نظر کی نمائندگی کر رہے تھے۔ وقت کے ساتھ بے شمار مکتبۂ فکر اردو تنقید میں داخل ہوئے اور آج اردو تنقید میں جمالیاتی و تاثراتی تنقید، نفسیاتی تنقید، مارکسی تنقید، سائنٹفک تنقید، توضیحی تنقید، تقابلی، ساختیاتی تنقید، نسائی تنقید وغیرہ۔ جیسے کئی رجحانات دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہ بات تو واضح ہے کہ جدید اردو نثر میں ابتدا سے ہی دو متوازی رجحانات نظر آتے ہیں۔ افسانہ، ناول کی طرح تنقید میں بھی ایک رجحان عقلیت پسندی اور مقصدیت کا ہے تو دوسرا وجدانی کیفیت اور مسرت بہم پہنچانے کا۔ چونکہ ادب اور شعر کا تصورِ حسن سے گہرا تعلق ہے لہذا جمالیاتی تنقید ادب میں حسن کی تلاش کو اہمیت دیتی ہے۔ مغربی ادب میں جمالیاتی تنقید کی دو خاص صورتیں نظر آتی ہیں۔ ایک تاثراتی انداز ہے جس کے ڈانڈے رومانی تحریک سے مل جاتے ہیں۔ اور دوسرا ''اظہاریت'' کا انداز ہے جس پر کروچے کے نظریات کا گہرا اثر ہے۔ اردو تنقید

Scanned by CamScanner

کے حوالے سے دیکھا جائے تو ایسی واضح تقسیم کرنا مشکل عمل ہے۔ آزاد، شبلی، مہدی، افادی، سجاد انصاری، فراق گورکھپوری، عبدالرحمٰن بجنوری، مجنوری گورکھپوری، نیاز فتحپوری، رشید احمد صدیقی، محمد حسن عسکری، خورشید الاسلام، عابد علی عابد وغیرہ عام طور پر رومانوی یا جمالیاتی نقادوں میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سب کے ہاں بیک وقت ایک سے زیادہ رجحانات تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نمایاں ترین رجحان ہونے کی وجہ سے جمالیاتی تنقید ہی ان سب کی شناخت ہے۔ مثال کے طور پر شبلی اور آزاد دونوں کا انداز نقد تاثراتی رہا۔ شبلی چونکہ مزاجاً مورخ اور محقق بھی تھے اس لئے مکمل طور پر تاثراتی نقاد نہ بن سکے، لہٰذا شبلی یا دیگر ناقدین کا ذکر جمالیاتی تنقید کی ذیل میں کر دینے کا یہ مطلب نہیں یہ ناقدین کسی ایک نظریے کے پابند تھے۔

شبلی اور آزاد کے بعد جمالیاتی اور تاثراتی رجحان رکھنے والے نقادوں میں نیاز فتحپوری، یلدرم، سجاد انصاری اور مہدی افادی کے نام آتے ہیں۔ یہ سب ادب میں حسن کاری پر زور دیتے ہیں۔ نیاز فتح پوری کے بارے میں آل احمد سرور لکھتے ہیں۔

> ''نیاز کے ہاں ایک نازک جمالیاتی احساس کے ساتھ قدیم ادبی سرمائے سے گہری اور جدید سرمائے سے خاصی واقفیت ملتی ہے جسے ان کی انشا پردازی نے حسن دیا ہے۔'' [۸]

اسی طرح مہدی افادی کے بارے میں مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں کہ:

> ''بحیثیت تنقید نگار وہ کچھ پیٹر کی یاد دلاتے ہیں، پیٹر کا تنقیدی اسلوب محاکاتی یا ارتسامی Impressionistic ہوتا ہے جس کو ہنر لٹ اور لیمب کا ترکہ سمجھنا چاہیے۔ افادی الاقتصادی کا انداز تنقید بھی یہی ہے، اردو میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تنقید کو ادب لطیف بنایا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ پیٹر کی طرح انہوں نے بھی تنقید کو شاعری اور وہ بھی غزل کے مرتبے کی چیز بنا دیا'' [۹]

Scanned by CamScanner

عبدالرحمٰن بجنوری کی تنقید میں تاثراتی انداز کے ساتھ نفسیاتی انداز بھی موجود ہے۔ان کی نظر بیشتر محاسن کی جانب ہوتی ہے۔''محاسن کلام غالب'' کی ابتداء ہی ان کے تاثراتی اور جذباتی انداز کی غماز ہے۔

> ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔وید مقدس اور دیوان غالب۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں''۔[۱۰]

فراق گورکھپوری نے اپنی تنقید کو خود ہی ''خلاقانہ'' تنقید یا تاثراتی تنقید قرار دیا۔اپنے مضامین کے مجموعے ''اندازے'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

> ''میری غرض وغایت اس کتاب کی تصنیف میں یہ رہی کہ جو جمالیاتی ،اضطراری اور مجمل اثرات قدماء کے کلام کے میرے کان، دماغ،دل اور شعور کی،تہوں پر پڑے ہیں،انہیں دوسروں تک اس صورت میں پہنچادوں کہ ان اثرات میں حیات کی حرارت وتازگی قائم رہے۔میں اسی کو خلاقانہ تنقید یا زندہ تنقید کہتا ہوں۔اسی کو تاثرانہ تنقید بھی کہتے ہیں۔''[۱۱]

مجنوں گورکھپوری کے ابتدائی مضامین بھی فراق کی طرح تاثراتی انداز رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ جملے دیکھیے جو مجنوں نے میر کے بارے میں لکھے ہیں۔

> ''اردو شاعری بھی اپنا خدا رکھتی ہے اور وہ میر کہلاتا ہے۔تذکرہ نویسوں نے بالاجماع اس کی درگاہ میں اپنی حمد وثنا پیش کی ہے۔شعرا نے اس کے آگے سر بندگی جھکایا ہے۔کوئی تذکرہ نویس یا شاعر ایسا نہیں ملے گا جس نے میر کے خدائے سخن ہونے سے انکار کیا

Scanned by CamScanner

ہو۔'' [۱۲]

یہ انداز مجنوں کے ابتدائی مضامین میں تو نظر آتا ہے لیکن آگے چل کر ادیب کے حالات زندگی اور سماجی پس منظر کو بھی اہمیت دی، اور ان کا انداز نقد تبدیل ہوا۔

رشید احمد صدیقی بھی مکمل طور پر تاثراتی نقاد قرار نہیں دیے جاسکتے لیکن ان کا جھکاؤ واضح طور پر جمالیات کی جانب نظر آتا ہے۔ حسن عسکری تاثراتی نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی نقاد بھی ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی ادب سے بے حد متاثر تھے۔ اور نثر کا مخصوص انداز رکھتے تھے۔ خورشید الاسلام بھی تاثراتی انداز میں تنقید کرتے ہیں۔ ان کی تنقید بھی تخلیق کی حیثیت رکھتی ہے بقول ڈاکٹر شارب ردولوی

''خورشید الاسلام کی تنقید کا اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی تاثریت'' پاسبان عقل'' کی رہنمائی میں چلتی ہے۔'' [۱۳]

یہ سب ناقدین، ادب میں حسن کاری کو بنیادی عنصر قرار دیتے ہیں اور ''ادب'' کی مقصدیت سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک فن کا اصل مقصد حسن کی دریافت اور مسرت بہم پہنچانا ہے۔ رسکن، آسکر وائلڈ، والٹر پیٹر وغیرہ کے اثرات بھی ان کی تحریروں پر دیکھے جاسکتے ہیں جو ادب میں فن برائے فن کے شدید حامی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ تاثراتی یا جمالیاتی ناقدین کسی ادب پارے پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو وہ در اصل ان کی اپنی تخلیقی اپج اور ذات کا اظہار ہوتا ہے۔ سرسید تحریک کی خشک مقصدیت کے مقابلے میں تاثراتی یا جمالیاتی ناقدوں نے لوگوں کو آزادی رائے کا رستہ دکھایا۔ بندھے ٹکے انداز میں سوچنے کے بجائے نئے انداز میں چیزوں کو دیکھا اور دکھایا۔ اس طریقہ تنقید پر اعتراض بھی کیے گئے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ایک شخص کے تاثر کو تنقید کا معیار نہیں قرار دیا جاسکتا۔ جمالیاتی اور تاثراتی تنقید سے متعلق کئی سوال اٹھے۔ مثال کے طور پر کیا جمالیاتی اقدار کسی ادب پارے کو پرکھنے کے لئے کافی ہیں؟ کیا جمالیاتی اقدار سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کی پیداوار نہیں ہوتیں؟ اگر ہوتی ہیں تو پھر جمالیاتی تنقید کی ادب

Scanned by CamScanner

پارے کے سماجی اور تہذیبی پس منظر کو کیوں کر نظر انداز کر سکتی ہے؟ کیا موضوع اور مواد کی افادیت کی کوئی اہمیت نہیں؟ ایسے کئی مسائل و مباحث تاثراتی اور جمالیاتی تنقید کے زیر اثر یا اس کے ردعمل میں سامنے آئے۔

جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کا رشتہ اگر رومانیت سے جڑا ہوا نظر آتا ہے تو دوسری طرف علم نفسیات سے بھی اس کا تعلق واضح ظاہر ہے۔ ابھی تک ہم جس چیز کو ''اظہاریت'' اور ''تاثریت'' کا نام دیتے چلے آرہے ہیں۔ اس کا رشتہ یقیناً ''انسانی رویہ'' (behaviour) سے ہے اور انسان کے ظاہری اور باطنی رویوں کا اظہار ہی نفسیات کا موضوع ہے۔

نفسیاتی تنقید شاعر و ادیب کے بیرونی تخلیقی رویے کو، یعنی ادب پارے کو، اس کے اندر رونما ہونے والے تخلیقی رویوں سے جوڑ کر دیکھتی ہے۔ ادیب یا شاعر کی انفرادی شخصیت، اس کی ذہنی پیچیدگیاں اور تجربات، اور ادب پارے میں ادیب کی شخصیت کی تلاش کو نفسیاتی تنقید میں اہمیت دی جاتی ہے۔ ادیب اور اس کی تخلیقات کو فرائڈ، یونگ اور ایڈلر کے نفسیاتی نظریات کے تحت دیکھا جاتا ہے۔ آج ان ماہرین کے نفسیاتی نظریات کی بے شمار تعبیرات اور تشریحات کی جا چکی ہیں۔ کئی دیگر ماہرین کی آراء بھی سامنے آچکی ہیں، مگر آج بھی نفسیاتی تنقید کا سلسلہ فرائڈ، ایڈلر، اور یونگ سے زیادہ آگے نہیں بڑھا ہے۔

اردو تنقید میں اگرچہ حالی، شبلی اور وحید الدین سلیم کی تنقید میں بھی نفسیاتی بصیرت ملتی ہے مگر مرزا رسوا وہ پہلے نقاد ہیں جو علم النفس کی روشنی میں ادب کی تفہیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر بھی مرزا رسوا کو پہلا نفسیاتی نقاد قرار دیتے ہیں۔ احساس، شعور، تخیل، تشبیہ و استعارے کے نفسیاتی پہلو رسوا کے یہاں سب سے پہلے زیر بحث آئے ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں کہ

> ''اردو میں شعر و ادب کو علم النفس کے نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ سوائے اس کے کچھ لوگوں نے ہلکے ہلکے اشارے کیے تھے لیکن مرزا رسوا نے ان مراسلہ نما مقالات میں ادب کو پہلی بار

Scanned by CamScanner

نفسیات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔اس میں شک نہیں کہ یہ
مقالات اردو تنقید میں نفسیاتی رجحان لانے کے محرک ہوئے ہیں اور
ادب کے عناصر و اجزا کو نفسیات کی روشنی میں سمجھنے
کے لئے مشعل راہ بنے ہیں۔"[۱۴]

میراجی اردو کے پہلے نقاد ہیں جو فرائڈ کے اصول تحلیل نفسی کو تنقید میں استعمال کرتے ہیں۔وہ تحلیل نفسی کے عمل سے شاعر کی جنسی نا آسودگیوں کو ہی تلاش نہیں کرتے بلکہ اسکے خیال ،خواب اور اجتماعی لاشعور تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔گویا ان کا دائرہ کار صرف فرائڈ کے نظریات تک محدود نہیں ہے۔مثال کے طور پر قیوم نظر کی نظم "خیالات پریشان" کے ذریعے جب وہ شاعر کی تحلیل نفسی کرتے ہیں تو اسکے خیالات کا رشتہ اجتماعی لاشعور سے جوڑ دیتے ہیں۔لکھتے ہیں

"نسلی تجربات کے لحاظ سے اب بھی وہ تاثرات جو انہیں جنگلوں میں
حاصل ہوئے تھے ان کے نفس لاشعور میں موجود ہیں اور اکثر یہ نسلی
تجربات ادب کے ذریعے ظاہر ہوتے ہیں۔" [۱۵]

ریاض احمد بھی نفسیاتی نقاد ہیں اور ادب کی تخلیق میں انسانی نفسیات کے عمل کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔شبیہ الحسن بھی اصول نفسیات کو خصوصاً پیش نظر رکھتے ہیں۔سلیم احمد اور حسن عسکری کے بھی بعض مضامین نفسیاتی تنقید کی ذیل میں رکھے جا سکتے ہیں۔ڈاکٹر وحید قریشی ،محمد اجمل ،سجاد باقر رضوی،ڈاکٹر سلیم اختر ،ڈاکٹر وزیر آغا،ابن فرید،دیوندر اسر،سلام سندیلوی وغیرہ کا اساسی حوالہ نفسیاتی تنقید ہی ہے۔

تاثراتی تنقید کی طرح نفسیاتی دبستان تنقید پر بھی اعتراض کیا گیا کہ فنی اور ادبی اقدار کا تعین صرف تحلیل نفسی کی بنیاد پر کرنا ممکن نہیں ہے۔ہاں اس طریقہ تنقید سے ادب اور ادیب کی انفرادیت کے بعض نئے گوشے ضرور ابھر کر سامنے آسکتے ہیں۔

جمالیاتی اور نفسیاتی تنقید کی طرح مارکسی یا ترقی پسند تنقید کا سلسلہ بھی حالی کی مقدمہ شعر و

Scanned by CamScanner

شاعری سے جوڑا جا سکتا ہے۔ حالی نے ''مقدمہ'' میں سوسائٹی اور شاعری کے باہمی تعلق پر جو بحث کی ہے، اس سے مقصدیت اور ادبی افادیت کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ ۱۹۳۵ء کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تنقید میں باقاعدہ سماجی اور اقتصادی رجحان نظر آیا۔ اختر حسین رائے پوری نے سب سے پہلے مارکس کے نظریات کے تحت ادب کا مطالعہ کیا۔ وہ ادبی تقاضوں کے ساتھ بلکہ ان تقاضوں سے بڑھ کر سماجی تقاضوں پر زور دیتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کا ذکر اوپر کی سطور میں جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کی ذیل میں ہو چکا ہے۔ ان کا ابتدائی تنقیدی رنگ تاثراتی تھا لیکن آگے چل کر انہوں نے مارکسی نقطۂ نظر سے بھی استفادہ کیا اور وہ ادب اور زندگی کے رشتوں کا تعین کرتے ہوئے مارکس کے جدلیاتی نظریہ کو بھی پیش نظر رکھنے لگے۔ لکھتے ہیں کہ:

> ''ادب بھی ایک جدلیاتی حرکت ہے جس کے دو متضاد پہلو ہیں ایک تو خارجی یا عملی یا افادی، دوسرا داخلی یا تخیلی یا جمالیاتی حسن کار۔ ادب کا کام یہ ہے کہ وہ بظاہر دو متضاد میلانات کے درمیان توازن اور ہم آہنگی قائم کیے رہے۔'' [۱۶]

احتشام حسین نظریاتی اعتبار سے ترقی پسند تھے لیکن تنقید میں انہوں نے سائنٹفک انداز اختیار کیا۔ اور ترقی پسند تنقید کی بنیاد سائنٹفک انداز پر رکھی۔ وہ مارکس کے خیالات سے متاثر ضرور ہیں لیکن جمالیاتی حسن، تاثرات اور نفسیاتی رویے پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ تخلیقی عمل کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے اور پوری دیانت داری کے ساتھ اپنا نظریہ بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ تنقید کے اسی طریقہ کار کو سائنٹفک سمجھتے ہیں جو کسی بھی اہم پہلو کو نظر انداز نہ کرے۔ لکھتے ہیں کہ

> ''سائنٹفک نقطۂ نظر وہ ہے جو ادب کو زندگی کے معاشی، معاشرتی اور طبقاتی روابط کے ساتھ متحرک اور تغیر پذیر دیکھتا ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر نقطۂ نظر ہے اور ادبی مطالعے کے کسی اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کر

Scanned by CamScanner

سکتا۔" [۱۷]

سجاد ظہیر اس خطے میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ وہ کلاسیکی ادب کا مطالعہ بھی مارکسی فلسفے کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم ادب پارے کی تاریخی اہمیت کے ساتھ ادیب کی سماجی ذمہ داری کا رشتہ ادب سے جوڑتے ہیں لیکن جمالیاتی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اختر انصاری بھی ادب کو ایک سماجی عمل قرار دیتے ہیں۔ سردار جعفری ترقی پسند نقاد ہونے کے علاوہ تحریک کے مورخ بھی ہیں۔ ممتاز حسین، عبادت بریلوی، ڈاکٹر محمد حسن، اسلوب احمد انصاری، ظ۔ انصاری اور ڈاکٹر قمر رئیس سائنٹفک مارکسی تنقید کی طرف مائل رہے۔ یہ سب ناقدین ادب کی عصری اہمیت اور آفاقیت کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل بھی سیاسی و سماجی شعور کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ اسکے ساتھ وہ جدیدیت کے سخت ناقد کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی بھی مارکسی نقاد ہیں۔ ساتھ ہی وہ مغربی ادبیات اور جدید تحریکوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر بلال نقوی، پروفیسر سحر انصاری بھی اہم ترقی پسند نقادوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا مارکسی یا ترقی پسند نقاد سماجی رشتوں، تہذیبی تبدیلیوں اور طبقاتی کشمکش کو ادب سے منسلک کرتے ہیں۔ احتشام حسین لکھتے ہیں کہ

> "ادب کی سماجی اہمیت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک ہم ادیب کو باشعور نہ مانیں، اس لئے ادب کا مادی تصور سب سے پہلے اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ ادب انسانی شعور کی وہ تخلیق ہے جس میں ادیب اپنے ذہن سے باہر کے مادی اور خارجی حقائق کا عکس مختلف شکلوں، میں مختلف فنی قیود اور جمالیاتی تقاضوں کے ساتھ پیش کرتا ہے۔" [۱۸]

اگر ترقی پسند تحریک میں نقادوں کا ایک گروہ ایسا رہا جس نے تنقید میں سائنٹفک انداز اختیار کیا تو ترقی پسند تحریک سے باہر بھی ناقدین کا ایک ایسا گروہ نظر آتا ہے جو سائنٹفک انداز

Scanned by CamScanner

رکھتے ہیں۔ ان ناقدین میں ڈاکٹر اعجاز حسین، آل احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی، اختر اورینوی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سید عبداللہ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے نزدیک سائنٹفک تنقید سے مراد یہ نہیں کہ تنقید میں مکانیکی طریقہ اختیار کیا جائے بلکہ سائنسی انداز کا مفہوم یہ ہے کہ ادب پارے کا کوئی اہم پہلو نظر انداز نہ کر دیا جائے اور کسی مخصوص دبستان سے وابستہ ہونے کے بجائے ایک ایسا انداز تنقید اختیار کیا جائے جو تمام تنقیدی مکتبہ ہائے فکر کو سامنے رکھے اور ادب کی تفہیم ہر پہلو سے ممکن بنائے۔

اردو کے تنقیدی دبستانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ادیبوں کا ایک ایسا گروہ بھی سامنے آتا ہے جو ادب کی پرکھ کے لئے صرف اور صرف مغربی فکر اور نظریے کو بنیاد بناتے ہیں۔ ان میں سرِ فہرست کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر احسن فاروقی کے نام ہیں۔ یہ دونوں اپنی جگہ اہم نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔

جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات مابعد جدیدیت اور اسلوبیات کے مباحث سے روشنی حاصل کرنے والی تنقید بھی مغربی ادب سے استفادے کی ہی ایک صورت ہے۔ گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی اور شمیم حنفی ان جدید رویوں سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں۔ ان رویوں کو بعض نقاد ترقی پسند تحریک کا ردِ عمل اور بعض رومانیت کی توسیع قرار دیتے ہیں۔ ان ناقدین نے جدید رویوں کو تنقید میں مقبول بنایا اور لوگوں کو نئے مباحث کی جانب متوجہ کیا۔ ژاک دریدا اور لاکاں کے زیرِ اثر جو تشکیل اور ردِ تشکیل کا نظریہ آیا وہ بھی ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

اس جگہ تحقیقی تنقید کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہوگا۔ تحقیق کا کام تنقید کے بغیر نامکمل ہے اور تحقیق کے بغیر تنقید کا کام ادھورا ہے۔ تنقید اور تحقیق کا یہ رشتہ اردو ادب میں سرسید، حالی آزاد اور شبلی سے لے کر آج تک برقرار ہے۔ جدید محققین کی فہرست میں کئی اہم نام نظر آتے ہیں مثال کے طور پر مولوی عبدالحق، محمود شیرانی، امتیاز علی خان عرشی، دتاتریہ کیفی، حبیب الرحمٰن خان شیروانی، حامد حسن قادری، شیخ چاند، قاضی عبدالودود، مسعود حسن ادیب، محی الدین قادری زور، نصیر الدین

Scanned by CamScanner

ہاشمی، عبدالقادر سروری، مسعود حسین خان، فرمان فتح پوری، نورالحسن ہاشمی، تنویر احمد علوی، رشید حسن خان، خلیق انجم، عتیق صدیقی، نذیر احمد، وغیرہ۔ ان سب محققین نے تحقیق میں گہرے تنقیدی شعور کے عمل کو یقینی بنایا۔ تحقیق کے دوران تنقید کئی فرائض انجام دیتی ہے ایک اعتبار سے یہ محقق کا تنقیدی شعور ہی ہے جو اسے کسی فیصلے پر پہنچنے میں مدد کرتا ہے۔ تقابل یا موازنہ، تشریح یا توضیح اور تجزیہ یہ سب تنقیدی طریقہ کار ہیں جن سے محقق بھی مدد لیتے ہیں۔ گویا تحقیقی کاموں میں بھی اعلیٰ درجے کی تنقید نظر آجاتی ہے۔

مذکورہ بالا تنقیدی دبستانوں میں سے ہر ایک کا رشتہ کسی نہ کسی طرح مغربی تنقید سے مل جاتا ہے۔ تاہم یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ اردو تنقید نے مغربی تصورات، فلسفے اور تحریکوں کا اثر ضرور قبول کیا لیکن صرف وہی رجحانات آگے بڑھے اور پھلے پھولے جو سماج اور تہذیب سے اپنا رشتہ قائم کر سکے۔ مغرب سے اثر قبول کرنے کے باوجود آج اردو تنقید اپنا علیحدہ مزاج رکھتی ہے۔ اردو کے ہر نقاد کا مغربی تنقید کے کسی نہ کسی خانے میں رکھا جانا ضروری نہیں۔ بہت سے نقاد ایسے ہیں جو بیک وقت کئی دبستانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کے شعراء، ادبا یا نقاد مغربی خیالات و نظریات کو من و عن قبول نہیں کر سکتے۔ انفرادی ذوق اور اجتماعی فکر و تہذیب کے زیرِ اثر ہر نقاد مغربی نظریات کا مطالعہ کرتا ہے، انہیں پرکھتا ہے اور پھر اپنے نظام فکر کا جزو بناتا ہے۔ اسی لئے رومانیت ہو یا مارکسزم، ترقی پسندی ہو یا جدیدیت، اردو کا ہر دبستان تنقید اپنا مزاج رکھتا ہے جو مغرب کی مارکسیت، رومانیت اور جدیدیت سے مختلف نظر آتا ہے۔ یہی صورت تنقید کے نسائی دبستان کی بھی ہے۔

نسائی تنقید کا دبستان مذکورہ بالا دبستانوں سے مختلف بھی ہے اور ان دبستانوں کو overlap بھی کرتا ہے۔ وہ یوں کہ اردو کی نسائی تنقید جس معیار پر ادب کو پرکھتی ہے نہ وہ محض جمالیاتی ہے اور نہ مادی، نہ ہی محض ساختیاتی یا نفسیاتی۔ نسائی نقاد کے نزدیک کسی ادب پارے کو پرکھنے کا معیار تو یہ ہے کہ وہ ادب پارہ دنیا میں صنفی امتیاز اور عورت کی محکومی کے خاتمے کے لئے کتنا

Scanned by CamScanner

معاون و مددگار ہے۔ سماجی رشتوں کی نوعیت کسی فن پارے میں کیا نظر آتی ہے۔ اور شاعر یا ادیب اس پدری معاشرے کو endorse کرتا ہے یا معاشرے کی hierarchy میں تبدیلی کا خواہش مند ہے۔ چونکہ سماجی رشتوں کی تبدیلی اور پدری نظام کے خاتمے کی جدجہد ایک چومکھی جنگ ہے جس میں علمِ نفسیات، اقتصادیات، لسانیات، اسلوبیات سمیت تمام علوم سے استفادے کی ضرورت ہے لہٰذا نسائی نقاد کسی بھی ادب پارے میں موجود مادی، جمالیاتی یا تہذیبی اقدار کو غیر اہم نہیں قرار دیتے بلکہ ان سب اقدار کو وہ عورتوں کے حق میں استعمال کرنے کے خواہش مند ہیں۔

اردو کی نسائی تنقید پر گفتگو سے پہلے یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ کیا وہ تمام تنقیدی کام جو خواتین نے سرانجام دیا وہ نسائی تنقید میں شمار ہوگا یا صرف وہ تنقید ''نسائی تنقید'' کہلائے گی جو فیمنزم کے شعور اور فیمنسٹ نقطہ نظر کے شعوری احساس کے ساتھ تحریر کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں فیمنسٹ حلقوں میں اختلاف موجود ہے۔ ایک حلقہ کا کہنا ہے کہ وہ تمام کام تنقیدی یا تخلیقی، جو عورتوں نے سرانجام دیے انہیں فیمنسٹ قرار دینا چاہیے کیونکہ ان سب کاموں میں کہیں نہ کہیں اس حسیت اور شعور کا اظہار ہوتا ہے جسے نسائی حسیت یا نسائی شعور کہتے ہیں۔ ان کا لہجہ اور زبان کہیں نہ کہیں ان کے عورت ہونے کی توثیق کر جاتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ عورتوں کے ہاتھوں سرانجام پانے والے تمام تخلیقی یا تنقیدی کام ''نسوانی'' Feminine یا women's تو کہلائے جا سکتے ہیں Feminist نہیں۔ فیمنسٹ تو صرف وہی کام ہوں گے جن کے پیچھے عورتوں کے حقوق کے لئے شعوری کوشش نظر آئے گی۔ خواہ وہ کام عورتوں نے کئے ہو یا مردوں نے۔

اردو ادب میں جہاں تک ان تنقیدی کارناموں کا تعلق ہے جو عورتوں نے تنقید میں انجام دیے تو اس سلسلے میں میری کتاب ''اردو کی ادبی تحقیق و تنقید میں خواتین کا حصہ'' [۱۹] دیکھی جا سکتی ہے جس میں ۱۹۹۷ء تک سامنے آنے والے ان تحقیقی و تنقیدی کاموں کا احاطہ کیا گیا ہے جو خواتین نے سرانجام دیے۔ اس سلسلے میں پہلا نام ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ کا سامنے آیا جنہوں نے ۱۹۴۰ میں اردو ناول پر مقالہ تحریر کیا۔ اس مقالے پر انہیں لندن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

Scanned by CamScanner

کی گئی۔ اس کے بعد بے شمار ایسی خواتین نظر آئیں جنہوں نے نہ صرف اعلیٰ اسناد کے لئے مقالے تحریر کیے بلکہ اعلیٰ درجے کی محقق اور ناقد ثابت ہوئیں۔ مثال کے طور پر

ڈاکٹر میمونہ انصاری

ڈاکٹر سیدہ جعفر

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

ڈاکٹر ثریا حسین

پروفیسر وحیدہ نسیم

ممتاز شیریں

ڈاکٹر آمنہ خاتون

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم وغیرہ

اس کتاب کی تکمیل یعنی ۱۹۹۷ء کے بعد سے آج تک اردو تنقید میں نسائی حوالے سے خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ فیمنسٹ نقطہ نظر جو اب تک تخلیقی ادب میں زیادہ نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا تھا، پچھلے دس بارہ سالوں میں تنقید میں بھی واضح ہو کر ابھرا ہے اور تنقید کے نسائی دبستان کے خدوخال اب خاصے صاف نظر آنے لگے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی نسائی تنقید کے، جسے وہ تانیثی تنقید کہنا بہتر سمجھتے ہیں، تین درجات متعین کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں [۲۰]

۱۔ ''تانیثی تنقید کا ادنیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ عورتوں کی تحریروں کو بجائے خود اہم اور لائق مطالعہ قرار دے کر ان کا مطالعہ کیا جائے''۔

پھر لکھتے ہیں کہ

۲۔ ''تانیثی تنقید کا دوسرا درجہ یہ ہو سکتا ہے کہ مردوں کے بنائے ہوئے متون کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے کیا جائے کہ ان میں عورتوں کے بارے میں کیا تصورات اور اصول شعوری طور پر پیش

Scanned by CamScanner

کیے گئے ہیں۔"

اور تیسرا درجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ

۳۔ "تانیثی مطالعات کا اگلا درجہ یہ ہوسکتا ہے کہ عورتوں کے بنائے ہوئے متون کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے کیا جائے کہ ان میں عورتوں کے بارے میں کس قسم کے تصورات، مفروضات اور نظریات پیش کیے گئے ہیں۔"

شمس الرحمٰن فاروقی کی اس درجہ بندی سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس بات کی خاطر خواہ وضاحت نہیں ملتی کہ وہ کن بنیادوں پر یہ درجہ بندی کر رہے ہیں کیونکہ فیمنسٹ نقطہ نظر سے عورتوں کی تحریروں کو بجائے خود اہم سمجھنا اور تاریخ میں منصفانہ مقام دلانا بھی اسی قدر ضروری ہے جتنا ادب میں عورتوں کے بارے میں تصورات، مفروضات اور نظریات کا مطالعہ کرنا۔ دراصل یہ دونوں کام ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

اگر ان درجات کو تین مراحل قرار دے دیا جائے تو، یہ حقیقت ہے کہ اردو فیمنسٹ تنقید انہی مراحل سے گزرتی دکھائی دیتی ہے۔ اردو میں فیمنسٹ تنقید کی اولین کاوش یہی رہی کہ عورتوں کے تخلیق کردہ ادب پاروں کو وہ اہمیت مل سکے جس کی وہ مستحق ہیں اور جو انہیں نہیں مل سکی ہے۔ اس کی وجہ بھی صاف ظاہر ہے۔ اردو ادب کی تاریخ عرصے تک خواتین کے ناموں سے مبرا نظر آتی ہے۔ چند شہزادیوں کے علاوہ علم و ادب کے حوالے سے کوئی نام نظر نہیں آتا۔ اس صورتِ حال میں ہر ذی ہوش کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا خواتین اس قدر کند ذہن اور تخلیقی صلاحیت سے اس قدر عاری تھیں کہ علمی ادبی کام ان کے بس سے باہر تھا۔؟ ایسے سوالات کے جوابات کی تلاش کی گئی تو معلوم ہوا کہ میر تقی میر کی صاحبزادی بھی شاعرہ تھیں لیکن میر کے نکات الشعرا میں اپنی جگہ نہ بنا سکیں۔ ثابت ہوا کہ عورتیں اٹھارویں صدی میں بھی شعر کہنے کی صلاحیت رکھتی تھیں لیکن تاریخ میں ان کے ناموں کی جگہ بننا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا آج کی نسائی/فیمنسٹ نقاد ایک طرف تاریخ میں عورتوں کے گمشدہ ناموں کی تلاش کر رہے ہیں تو دوسری طرف تاریخ میں موجود عورتوں کے ناموں

Scanned by CamScanner

کو ان کا درست مقام دلانے کی جدوجہد بھی کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کام دیکھیے۔

۱۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ (۱۹۹۲)
ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین، پٹنہ۔

۲۔ ڈاکٹر رشید جہاں حیات اور کارنامے (۱۹۹۰ء) شاہدہ بانو، مطبوعہ لکھنؤ۔

۳۔ اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار (۱۹۹۲ء) ڈاکٹر نیلم فرزانہ، علیگڑھ۔

۴۔ صالحہ عابد حسین بحیثیت ناول نگار (۱۹۷۶ء) نزہت فاطمہ۔ دہلی

۵۔ عصمت چغتائی بحیثیت ناول نگار (۱۹۹۴)، فرزانہ اسلم، دہلی

۶۔ اردو ادب میں خواتین کا حصہ (۱۹۶۴ء)، رفیعہ سلطانہ حیدرآباد دکن

۷۔ اردو کی ادبی تحقیق و تنقید میں خواتین کا حصہ (۲۰۰۰ء) عظمیٰ فرمان، کراچی۔

۸۔ ز، خ، ش (۲۰۰۷ء) فاطمہ حسن، کراچی

جہاں تک فاروقی صاحب کے دوسرے اور پہلے درجے کی تانیثی تنقید کا سوال ہے تو اس درجے کی تنقید کی بھی بیسیوں مثالیں اردو میں موجود ہیں۔ ان میں عورتوں اور مردوں کے لکھے ہوئے متون کا مطالعہ فیمنسٹ نقطہ نظر سے کیا گیا ہے اور یہ جائزہ لیا گیا کہ ان متون میں عورتوں کے بارے میں کیا نظریات اور مفروضات موجود ہیں۔ مثال کے طور پر چند مطبوعہ کتب کے عنوانات دیکھیے۔

۱۔ پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار (۱۹۷۵ء)، ڈاکٹر شمیم نکہت دہلی۔

۲۔ کرشن چند کے ناولوں میں نسوانی کردار (۱۹۸۸ء)، منور زمانی بیگم، دہلی

۳۔ نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار (۱۹۹۱ء) بشیر زینت، حیدرآباد

۴۔ اردو ناول میں عورت کا تصور (۱۹۹۳)۔ فہمیدہ کبیر، دہلی

۵۔ عورت اور اردو زبان (۱۹۹۳ء)، وحیدہ نسیم، کراچی

۶۔ اردو کے افسانے میں عورت کا تصور (۲۰۰۱ء) عصمت جمیل، ملتان

Scanned by CamScanner

۷۔ اردو ناول میں تانیثیت (۲۰۰۵ء) عقیلہ جاوید، ملتان

یہ صرف چند مبسوط کتابوں کے عنوانات تھے ان کے علاوہ کئی غیر مطبوعہ مقالات ایسے ہی موضوعات پر موجود ہیں۔ رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کی تو تعداد کا اندازہ ہی ممکن نہیں۔ یہ مضامین اس اعتبار سے۔ بے حد اہم ہیں کہ پچھلے دس سالوں میں اردو تنقید میں جو فیمنسٹ رجحان بہت نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے، اس رجحان کی ترقی بیشتر مضامین کے ذریعے ہی ہوئی ہے۔ ان پچھلے دس سالوں میں فیمنسٹ تنقید کے حوالے سے جو نمایاں نام نظر آئے ان میں زاہدہ حنا، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، فاطمہ حسن، یاسمین حمید، تنویر انجم، شاہین مفتی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تو صرف خواتین کا ذکر ہے۔ کئی مرد نقاد مثال کے طور پر ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر آصف فرخی، ڈاکٹر سلیم اختر وغیرہ بھی اس رجحان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

جیسا کہ ابتدا میں ہی کیا گیا اردو کی نسائی تنقید کا اپنا ایک علیحدہ مزاج ہے۔ اگر چہ تنقید کے دیگر دبستانوں کی طرح تانیثی تنقید / نسائی / فیمنسٹ تنقید کا رشتہ بھی مغربی فیمنسٹ تنقید سے جڑا نظر آتا ہے لیکن ہمارے ہر ادیب اور نقاد نے اپنے انفرادی ذوق اور افتادِ طبع کے مطابق اسے اپنایا ہے۔

عالمگیریت کے اس عہد میں جو ایک عمل پوری دنیا میں رونما ہوتا نظر آ رہا ہے، وہ یہ ہے کہ علوم و فنون کی آئندہ دنوں کی لیڈر شپ عورتوں کے ہاتھ میں آتی نظر آ رہی ہے۔ صرف پاکستان یا ہندوستان میں نہیں بلکہ پوری دنیا اس وقت، یہ سوال کر رہی ہے کہ کیا آنے والا وقت عورتوں کا ہوگا؟ اس تناظر میں نسائیت Feminism، gender studies اور women studies کی طرف لوگ متوجہ ہو رہے ہیں اور اپنے اپنے فلسفوں میں اس نئی لیڈر شپ کی گنجائش بھی پیدا کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج نسائیت کی بے شمار شاخیں ہیں جن میں سے چند کا ذکر پہلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ یہی نہیں آج ہر مکتبہ فکر اپنے دائرہ کار اور اپنے فلسفے میں عورتوں کے مقام اور حقوق کے بارے میں سوال اٹھا رہا ہے اور اپنے آپ کو نئی لیڈر شپ کے لئے تیار کر رہا

Scanned by CamScanner

ہے۔ تنقیدی حوالے سے دیکھیے تو جدیدین، مارکسی، سائنٹفک، نفسیاتی، جمالیاتی ہر مکتبہ فکر کا نقاد فیمنزم کو اپنے مزاج اور فلسفے کے مطابق پاتا ہے یا یوں کہئے کہ ہر مکتبہ فکر فیمنزم کو اپنے فلسفے کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ مثال کے طور پر شمس الرحمٰن فاروقی فیمنزم کا رشتہ جدیدیت سے جوڑتے ہیں اور اس لئے لکھتے ہیں کہ

> ''تانیثیت کو مارکسی طرز فکر سے ہمدردی نہیں کیوں کہ مارکسی فکر میں طبقاتی تقسیم کا نظام عورت کے الگ وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔''

اسی طرح ان کے خیال میں

> ''تانیثیت اور تحلیل نفسی یا فرائڈی فکر بھی کوئی خاص ہم آہنگی نہیں رکھتی کیونکہ فرائیڈ کی فکر تمام انسانی معاملات و تعلقات کو مرد کی جنسیت سے منسلک کرتی ہے''۔[۲۱]

ان خیالات کے پیچھے وہ نظریات کارفرما ہیں جن کے تحت تانیثیت مارکسزم یا فرائڈین فکر سے علیحدہ ایک فلسفہ ہے۔ دنیا میں مارکسزم کا قیام یا طبقاتی تقسیم کو مٹا دینا عورتوں کے مسئلے کا حل نہیں۔ نہ ہی یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے عورتوں کی محکومی ختم کرنے کے سلسلے میں پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ عورتوں کے مسئلے کو مذکورہ بالا مسائل سے الگ کر کے ایک علیحدہ مسئلہ تسلیم کیا جائے۔

جدیدیت پسند فیمنسٹ جس انداز میں سوچتے ہیں اس سے مارکسی یا دیگر فیمنسٹ طبقے اتفاق نہیں کرتے۔ کیونکہ مارکسی فیمنسٹ پیداواری ذرائع کے انقلاب کو پدرسری معاشرے کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے برعکس علی احمد فاطمی ایک Committed ترقی پسند ہیں وہ فیمنزم کو محض نظریاتی مسئلہ یا مباحثہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے عملی تحریک کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ نسائیت / فیمنزم کا رشتہ رشید جہاں سے جوڑتے ہیں جو اپنی ذات میں نسائی بغاوت کی اولین آواز تھیں۔ لکھتے ہیں

> ''آج جو نسائیت یا تانیثیت کی تحریک سر اٹھا رہی ہے اس میں بھی

Scanned by CamScanner

رشید جہاں کا خون پسینہ کام کر رہا ہے۔"[۴۲]

کشور ناہید کی آواز شاعری کے ساتھ تنقیدی حوالے سے بھی فیمنزم کی بہت اہم اور نمایاں آواز ہے۔ ''شناسائیاں''، ''رسوائیاں''، ''بری عورت کی کتھا''، ''بری عورت کے خطوط''، ''عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک''، ''عورت۔خواب اور خاک کے درمیان''۔۔۔ یہ سب کشور ناہید کی نثری کاوشیں ہیں۔ان کتابوں کے عنوانات سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کشور ناہید کے فکر و فن کا موضوع عورت ہے۔کشور ناہید نے سیمون ڈی بووا کی شہرہ آفاق کتاب ''سیکنڈ سیکس'' کا تلخیصی ترجمہ اردو میں ''عورت۔نفسیات کے آئینے میں'' کے نام سے کیا۔اس کے علاوہ اردو کی افسانہ نگار خواتین کا جائزہ بھی مرتب کیا۔نسائیت کے حوالے سے مرتب ہونے والے کئی انتخابات اور تراجم میں شریک رہیں۔

کشور ناہید کی تنقید اپنے اردگرد کے ماحول سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔اپنے عہد اور اپنے سماج سے جڑا رہنے کی وجہ سے وہ عورتوں کے مسائل اور ان سے متعلق تمام معاملات کا شعور رکھتی ہیں۔ عالمی ادبی مباحث سے لے کر عام پاکستانی عورت کے مسائل تک ہر موضوع کشور کی فیمنسٹ تنقید میں موجود ہے۔

ایک خدشہ جس کا احساس بار بار کشور ناہید کے ہاں نظر آتا ہے یہ ہے کہ فیمنزم کو محض نظریاتی مباحث اور دانشورانہ مکالموں تک محدود کیا جا رہا ہے۔ بحث برائے بحث اور ادب برائے ادب کی وہ قائل نہیں ہیں۔اسی لئے وہ سوال کرتی ہیں کہ

> ''وہ ادب جو انقلاب کا نقیب ہو وہ کون لکھے گا اور کیسے؟ جوان نسل کی آبیاری کرے گا۔ یا پھر دو نئے استعارے جو مردوں نے ایجاد کیے ہیں، ماں اور دھرتی، صرف ان لفظوں کے استعمال پر اکتفا کیا جائے گا''۔[۴۳]

گویا انہیں یہ احساس ہے کہ فیمنسٹ ادیب اور شاعر ذہنوں کو تبدیل کرنے اور نوجوان

Scanned by CamScanner

ذہن کی آبیاری کرنے کا کام اس درجے میں نہیں کر سکے جس درجے میں ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ انہیں یہ بھی احساس ہے کہ نئے ذہنوں پر اتنے گہرے اثرات مرتب کرنا اور انقلاب کی راہ ہموار کرنا اکیلے ادیب کے لئے مشکل ہے۔ اس کے لئے ابلاغ کے دیگر ذرائع کو بھی اپنا ہمنوا بنانا ہوگا۔ لکھتی ہیں

> ''ادیبوں کے توسط سے روشن خیالی کی فضا کیسے پرورش پا سکتی ہے
> جب کہ میڈیا نے تو روشن خیالی کو پاپ میوزک اور کم کپڑے پہننے میں
> دفن کر دیا ہے''۔[۲۴]

فہمیدہ ریاض نظریاتی اور عملی دونوں صورتوں میں فیمنسٹ ہیں۔ ان کی شاعری کا مزاحمتی رنگ اور اپنی رائے کا بے لاگ اظہار اردو ادب کی نسائی تحریک کا اہم سنگِ میل ہے۔ خاص طور پر ''بدن دریدہ'' سے اردو ادب میں نسائیت کے ایک نئے دور کی ابتداء ہوئی۔ پچھلے چند برسوں سے وعدہ (WADA) نامی تنظیم سے منسلک ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں فہمیدہ ریاض نے ''ادب کی نسائی ردِ تشکیل'' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی جس میں اردو کے چند نامور ادیبوں کے ہاں عورت کے تصور کی ردِ تشکیل کی گئی تھی۔ اس کتاب میں جس کی صورت دراصل ایک سیمینار یا مذاکرہ کی ہے، خود فہمیدہ ریاض کی بے حد اہم گفتگو شامل ہے۔

مذکورہ کتاب میں فہمیدہ ریاض نے کئی نامور ادیبوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کا خاص مضمون ن۔م راشد کے تصورِ زن کی ردِ تشکیل پر مشتمل ہے۔ راشد کی شاعری میں عورت کے تصور کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ

> ''عورت ان کے لئے ایک ہستی نہیں ایسی شے ہے جو ان کی توجہ کی
> مستحق تک نہیں ن۔م راشد جدید شعری حسیات کے مالک تھے
> جنہوں نے اردو ادب کو بہت حسین و جمیل، فکر انگیز اور لازوال نظمیں
> عطا کی ہیں، عورت کی حد تک قصباتی ذہن بلکہ ذہنیت کا مظاہرہ

Scanned by CamScanner

کرتے ہیں"۔[۲۵]

میراجی کے ہاں صورتِ حال اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ لکھتی ہیں کہ

"میراجی۔۔۔عورت کے "روپ" یا نسوانی جسم کو تکمیل "ذات" کے ایسے کھوئے ہوئے محبوب عنصر کی طرح ڈھونڈتے ہیں جو "مکمل" کا جزو لاینفک ہے۔ اس کے باوجود یہ تصوف کی شاعری نہیں ہے۔ محبوب کے دنیاوی وجود کو ذات اولیٰ میں تحلیل نہیں کرتی۔ عورت اس شاعری میں عورت ہی رہتی ہے اس لئے میراجی کی شاعری عورت کو ایک بلند مقام دیتی ہے"۔[۲۶]

میراجی کی شاعری کا جو رشتہ جو اس خطے کی تہذیب سے تھا۔ فہمیدہ ریاض اسے ذہن میں رکھتے ہوئے، میراجی کی شاعری میں نظر آنے والی عورت کا رشتہ قدیم ہندوستانی جمالیات کی اقدار سے جوڑتی ہیں۔ راشد کی ذہنی الجھنوں کو بھی وہ نظر انداز نہیں کرتیں۔ اسی طرح بیالوجی سے لے کر سیاست تک، تخلیق کا سارا منظر ان کی نظر میں رہتا ہے۔ آمرانہ طرزِ حکومت، کٹھ ملائیت اور استحصالی قوتوں کے اثرات بھی ان سے چھپے نہیں ہیں۔ ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کے بارے میں لکھتی ہیں

"ممتاز مفتی عورت کو ایک ذہنی مریض سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتے جب کہ اشفاق احمد "عورت" کو جنرل ضیاء الحق کی مرضی کے مطابق کانٹے چھانٹنے میں مصروف تھے۔"[۲۷]

ڈاکٹر انوار احمد بھی عورتوں کی محکومی کے مسئلے کو استحصالی نظام سے جوڑتے ہیں تعصب، ناانصافی اور امتیازات کو تحفظ دینے والے تمام قوتوں کے اپنے مخصوص طنزیہ لہجہ کا نشانہ بناتے ہیں لکھتے ہیں۔

"تانیثیت کے حوالے سے بعض انتہا پسند آوازیں ایسی بھی ہیں جو

Scanned by CamScanner

حیاتیاتی بنیاد پر بھی عورت کا مخصوص طور پر ذکر پسند نہیں کرتیں۔ مگر اس ساری تحریک کو اگر سماجی عدل کے ایک خواب سے منسلک کر کے دیکھا جائے تو پھر عورت ظلم اور ناانصافی کے ہدف کے طور پر سامنے نہیں آتی بلکہ وہ سماجی قوتیں بھی بے نقاب ہوتی ہیں جنہوں نے اپنے تعصب، امتیاز اور ناانصافی کو مذہب کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ اس لئے صبر و رضا، تقدیر و تقلید کا درس دینے کی کوشش پر سے اعتبار اٹھ رہا ہے۔ رجعت پسند اور استحصالی قوتوں کی مضحکہ خیزی آہستہ آہستہ پسپا ہو رہی ہے۔ نابینا عورت کو بے حیائی کا مرتکب قرار دینے والے قاضی کھسیانے ہو رہے ہیں اور شعرائے اردو کے تذکروں سے عورتوں کا نام خارج کرنے یا مثنویاں پڑھ کر عورت کے فحش ہو جانے کے خدشے میں مبتلا ناقد مسخرے دکھائی دے رہے ہیں"۔[۲۸]

زاہدہ حنا ہمارے عہد کی ایک اہم فیمنسٹ نقاد ہیں۔ ان کے اسلوب میں شعوری پختگی بھی نظر آتی ہے اور فلسفیانہ نہ فکر بھی۔ وہ عورتوں کی محکومی اور موجودہ احساسِ جبر کو سماجی، تاریخی اور معاشی شعور کے ساتھ دیکھتی اور بیان کرتی ہیں۔
لکھتی ہیں۔

"ہماری سیتا اگنی پرکشا سے گزرتی تھی اور میرا بائی پریم بیل کو آنسوؤں سے سینچتی تھی لیکن آج کی سوچنے والی اور لکھنے والی عورت کو ایک نیا چیلنج درپیش ہے پدرسری سماج کے ظلم و جبر کی دہائی دے کر اور ناز و ادا کی جھلک دکھا کر رعایتی نمبر لینے کا زمانہ گزر گیا۔ اب یہ معاملہ ذہانتوں، ریاضتوں اور تخلیق کے نئے افق تلاش کرنے کا ہے۔

Scanned by CamScanner

عورت اس موڑ پر آ پہنچی ہے جہاں وہ نیم سے مکمل انسان کے سفر میں ہے"۔

وہ پدرسری نظام کا رشتہ پیداواری ذرائع سے جوڑتی ہیں ان کا خیال ہے کہ

"طویل ارتقائی عمل کے نتیجے میں جب زرعی انقلاب برپا ہوا تو عورت دیوی سے داسی بنی۔ یہ دیوتاؤں کے عروج اور دیویوں کے زوال کا آغاز ہے۔ اس کے ساتھ ہی ذہین عورتوں کے پنپنے پر بھی پابندی لگی۔ مرد اپنی حاکمیت اور اقتدار کی سند آسمان سے لایا اور عورت کو فرشِ زمین بنا دیا"۔[۲۹]

تاریخی شعور، افسانہ نگاری کی تکنیک پر ان کا عبور، تخلیقی نثر، علم نفسیات اور فلسفیانہ مباحث پر گرفت یہ سب چیزیں مل کر زاہدہ حنا کو اس عہد کی بے حد اہم فیمنسٹ نقاد بنا دیتی ہے۔

"شکر گزار عورتوں کا ترانہ" کی خالق تنویر انجم لسانیات میں پی ایچ ڈی کی سند رکھتی ہیں تنویر انجم کا اندازِ نقد بھی بڑی حد تک سائنٹفک ہے۔ وہ تنقید میں زبان، تاریخ، نفسیات اور سیاست کسی حوالے کو نظر انداز نہیں کرتیں۔ ممتاز مفتی کے افسانوں پر بات کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ

"سب جانتے ہیں کہ وہ (ممتاز مفتی) ہمارے معاشرے میں موجود پدرسری نظام، آمرانہ ریاستی نظام، استحصالی معاشی نظام اور dogmatic نظریاتی نظام کو مستحکم رکھنے والی قوتوں کے ساتھ ہم آواز و ہم قدم رہے ہیں"۔[۳۰]

یاسمین حمید بھی نسائی تنقید میں اہم مقام رکھتی ہیں یاسمین حمید عورت کی بحیثیت انسان اور بحیثیت ایک فرد شناخت پر اصرار کرتی ہیں۔ شاہین مفتی نے عورت اور وجودیت کے باہمی تعلق پر نظر ڈالی ہے۔

تحقیقی حوالے سے بات کی جائے تو ڈاکٹر عصمت جمیل کی کتاب "اردو افسانے میں

Scanned by CamScanner

عورت'' کا حوالہ ضروری ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۱ء میں بہالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان نے شائع کی۔ یہ ڈاکٹر عصمت جمیل کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ عصمت جمیل نے اس مقالے میں عورت سے متعلق نظریات، تصورات اور مفروضات کا بڑی محنت سے جامع تاریخی جائزہ مرتب کیا ہے۔ جنوبی ایشیاء کے نسائی معاشرے کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جس سے عصمت نے صرف نظر کیا ہو۔ اردو افسانے میں عورت کے تصور کا بھی عصمت نے بڑی عمدگی سے تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ تحقیق و تنقید دونوں اعتبار سے عصمت جمیل کی یہ کتاب نسائی تنقید میں ایک اہم اضافہ ہے۔

فاطمہ حسن کی توجہ بھی تحقیق کی سمت رہی ہے۔ (زخ ش) زاہدہ خاتون شروانیہ پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کرنے کے بعد فاطمہ حسن کی دیگر کئی اہم تحریریں ان عورتوں کے حوالے سے سامنے آئیں جن کے نام ادب کے مورخین نے تاریخ میں شامل کرنے کی صورت نہیں سمجھی یا شامل کیے تو سرسری تذکرے کے ساتھ کیے۔ ''فیمنزم اور ہم'' ان کی نسائی تنقید کی ترجمان ہے۔ جس میں انہوں نے فیمنسٹ اردو ادب کا انتخاب کیا ہے۔ اس کے علاوہ آصف فرخی کے ساتھ مل کر'' خاموشی کی آواز'' اور شاہ محمد مری کے ساتھ ''بلوچستان کا ادب اور خواتین'' مرتب کیں۔[۳۱]

ڈاکٹر سلیم اختر بھی پچھلے چند برسوں سے خواتین کے حوالے سے لکھ رہے ہیں۔ وہ فیمنزم کا رشتہ نفسیات سے جوڑے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ

> ''یونگ نے انسانی شخصیت کے مطالعے کے لئے جو تصور پیش کیا ہے اس کے بموجب ہر مرد میں نسوانی روح Anima اور ہر عورت میں مردانہ روح Animus پائی جاتی ہے مرد میں کردار کی لطافت۔ نرم خوئی، جمال سے دلچسپی اور جمیل سے رغبتِ صبر و ضبط اور تحمل جیسے اوصاف Amina کے باعث ہیں۔۔۔۔ یہ جو بعض عورتوں کو مرد مار کہا جاتا ہے یا وہ جارحیت پر مبنی پہل قدمی والی ثابت ہوتی ہیں تو یہ Animus کے باعث ہے''۔[۳۲]

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر عقیلہ جاوید کی کتاب ''اردو ناول میں تانیثیت'' [۳۳]، ڈاکٹر جاوید اختر کی کتاب ''اردو کی ناول نگار خواتین'' [۳۴]، اکادمی ادبیات کی طرف سے شائع ہونے والے ادبیات کے خصوصی شمارے [۳۵]، گزشتہ چند برسوں میں شائع ہونے والی اہم فیمنسٹ تنقیدی کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ ASR گروپ کی جانب سے بھی کئی برسوں سے gender study کے موضوع پر کتابیں مرتب ہو کر شائع ہو رہی ہیں۔

موضوعاتی اعتبار سے مذکورہ بالا نقادوں کا جائزہ لینے کے بعد نسائی تنقید کے دو رجحانات واضح نظر آتے ہیں۔

۱۔ عورتوں کی تحریری روایت کی تلاش اور حفاظت

۲۔ ادبی سرمائے کا نسائی نقطہ نظر سے مطالعہ

اکثر نسائی ناقدین اپنی تحریروں میں پدرسری معاشرے کے اثرات اور gender politics کی طرف اشارے کرتے ہیں تاہم اس حوالے سے ابھی بہت کام کی گنجائش ہے۔ ان دو رجحانات کے علاوہ بھی کئی ایسے موضوعات ہیں جو بہت اہم ہیں موجودہ فیمنسٹ تنقید میں ان موضوعات کی جانب اشارے تو ضرور کئے گئے ہیں لیکن ابھی ان موضوعات پر مزید مباحثہ، مکالمے اور تفصیلی تجزیے کی ضرورت باقی ہے۔ ان موضوعات میں سے ایک مسئلہ زبان کا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان پر دنیا کی ہر زبان کی طرح، پدرسری معاشرے کی Conditioning ہو چکی ہے۔ مثال کے طور پر اردو میں زنانہ پن ایک منفی صفت تصور کی جاتی ہے جبکہ ''مردانگی'' ایک مثبت وصف خیال کیا جاتا ہے۔ ''عصمت'' اور ''عزت'' کے جو تصورات عورت کی صنف سے وابستہ ہیں مرد کی صنف سے اس طرح وابستہ نہیں اسی طرح ''غیرت'' کا جو تصور مرد کی صنف سے منسلک ہے عورت کے ساتھ نہیں ہے۔ ''خدا'' کے لئے یا نامعلوم صنف کے لئے تذکیر کا صیغہ استعمال کرنا ایک الگ موضوع ہے۔ فی الحال اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ زبان کے پس منظر میں کارفرما پدرسری سیاست بھی عورتوں کی محکومی کی راہ ہموار کرتی ہے جو آج کے نسائی نقاد

Scanned by CamScanner

کا اہم موضوع ہوسکتا ہے۔ اس موضوع کی طرف اگر چہ بعض اشارات ضرور موجود ہیں۔ مثلاً زاہدہ حنا کی کتاب میں، یا راجندر سنگھ بیدی کے ایک جملے کی فہمیدہ ریاض نے اپنے مضمون میں نشاندہی کی اور خیال ظاہر کیا کہ جب بیدی نے یہ جملہ تحریر کیا۔

''تو ان کے دائرہ خیال میں ہرگز نہیں ہوگا کہ یہ جملہ کوئی عورت بھی پڑھ رہی ہوگی''۔[۳۶]

ایک بیدی کا ہی ذکر نہیں ہمارے بہت سے موقر اور قابل احترام مصنفین کے ہاں ایسے فقرے یا جملے تلاش کیے جاسکتے ہیں جو یقیناً کسی مرد قاری کے لئے لکھے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ عبارت دیکھیے

''تاریخ بتاتی ہے کہ جب کوئی تہذیب ضعیف ہوتی ہے اس میں نسائیت پیدا ہوجاتی ہے۔ جسم و جنس کی قدریں ساری تہذیب پر غالب آجاتی ہیں اور خود غرضانہ بزدلی سب سے اہم قدر کا درجہ حاصل کرلیتی ہے۔ قوتِ عمل، مردانہ پن خود کو نئی قدروں اور خیالات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے آگے بڑھنے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ علی و سکندر عادل شاہ کے دور میں سارے دکن کی تہذیب اس عمل سے گزرتی دکھائی دیتی ہے۔ شاہی اور نصرتی کی غزل تہذیب کے اسی زنانہ پن اور بے عملی کی ترجمان ہے''۔

اس عبارت میں اگر چہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا مقصد کسی عورت کی تضحیک نہیں لیکن اس کے ذہن کی Conditioning اور زبان کے پس پردہ کارفرما پدرسری معاشرے کی صدیوں پرانی سیاست لکھنے والے کے قلم سے ایسے جملے لکھواجاتی ہے جس میں مردانہ پن کا لفظ قوتِ عمل کا مترادف ہے اور ''زنانہ پن'' بے عملی بزدلی اور خود غرضی کا۔ یہی نہیں بین السطور بھی اس عبارت میں پدرسری معاشرے کی سیاست اور اپنی کمزوری عورت کے سر منڈھنے کی کوشش

Scanned by CamScanner

صاف نظر آتی ہے۔

اسی طرح محمد جمیل احمد جب ''تذکرہ شاعراتِ اردو ادب'' مرتب کرتے ہیں تو ان کا مقصد نیک ہے لکھتے ہیں۔

> ''یہ صحیح ہے کہ عموماً خواتین کا کلام اس قدر بلند نہیں کہ اساتذہ کے کلام کے مقابلے پر لایا جا سکے تاہم صدہا شاعر ایسے نکالے جا سکتے ہیں جن کا کلام اکثر خواتین کے کلام سے پست ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ قلم چونکہ اب تک مرد کے ہاتھوں میں رہا اس لئے وہ عام طور پر عورت کو ٹھکراتا رہا ہے''۔[۳۷]

اس اعتراف اور شعور کے باوجود تذکرے سے شاہدان بازاری کو نکال باہر کیا جاتا ہے کیونکہ ''شریف خواتین و بیگمات کے دوش بدوش شاہدان بازاری کا تذکرہ ان بیگمات و خواتین کی توہین ہے'' یہاں پھر وہی سوال اٹھتا ہے کہ آخر کیا سبب ہے کہ تاریخ میں اپنا نام درج کروانے کے لئے عورت کو کردار کے صداقت نامے کی ضرورت پڑتی ہے۔۔ یہ ایک مثال ہے۔ ایسی کئی مثالیں ہماری تنقید اور تاریخ میں موجود ہیں۔ جن پر نسائی نقادوں کو توجہ دینی ہوگی۔

فیمنسٹ نقاد کی ایک اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ فیمنسٹ تحریک سے متعلق معاشرے میں، جو ابہام یا غلط فہمیاں موجود ہیں ان کو دور کرے تا کہ خواتین کے لئے ایک حوصلہ افزا فضا تیار ہو سکے۔ مثال کے طور پر ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا ہوتی ہے کہ نسائیت یا فیمنزم صرف اور صرف پدرسری معاشرے کے خلاف جدوجہد کا نام ہے۔ اس کے علاوہ دیگر استحصالی قوتوں سے فیمنزم لاتعلق ہے۔ یقیناً پدرسری معاشرے کے خلاف جدوجہد، عورتوں کی محکومی اور احساس جبر کی یقیناً فیمنسٹ نقطہ نظر میں بنیادی اہمیت ہے لیکن یہ بات ہمیں سمجھنی ہوگی کہ یہ تحریک دراصل ایک اور وسیع تر تحریک کا حصہ بھی ہے کیونکہ استحصال کی دوسری قوتیں، طبقاتی، نسلی اور لسانی امتیازات، اپنے اپنے طور پر جنسی / صنفی امتیاز اور پدری نظام کو سہارا دیتے چلے آئے ہیں۔ لہٰذا ہم یہ امید نہیں

Scanned by CamScanner

کر سکتے کہ دیگر امتیازات اور غیر منصفانہ رویوں کو ختم کیے بغیر Gender کی سیاست کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

اوپر جن فیمنسٹ ناقدین کا ذکر آیا ہے وہ سب فیمنزم کے ساتھ انسانی حقوق کی جنگ میں بھی حصے دار ہیں۔

اس حوالے سے ایک اور رجحان کا تذکرہ بھی ہو سکتا ہے جو تنقید نگاروں کی ذات میں نظر آتا ہے اور کہیں کہیں ان کی تنقید میں بھی در آتا ہے وہ یہ کہ ہمارے نقاد، مرد تو مرد، خواتین بھی feminist رجحانات رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو feminist کہلوانے سے کتراتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ شاید یہی ہے کہ feminism کسی ایک نظریے کا نام نہیں بلکہ ان سب نظریات کا مجموعہ ہے جو عورتوں کے مساوی حقوق کی حمایت کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں کچھ ابہام بھی پیدا ہوتے ہیں اور بعض چیلنج بھی سامنے آتے ہیں۔

ایک بڑی غلط فہمی جو عرصے تک نسائیت کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی تھی اور ہمارے سماج میں آج بھی ہے وہ یہ ہے کہ feminism مردوں کے خلاف کوئی تحریک ہے۔ ابتدائی دنوں میں بعض feminist عورتوں کے ہاں اس طرح کا رویہ ضرور دیکھنے میں آیا لیکن آہستہ آہستہ یہ جذباتیت ٹھنڈی پڑ گئی۔ ہاں بعض اوقات نسائی ادیب کے لہجے میں ایک جھنجلاہٹ ضرور نظر آجاتی ہے جو اپنی بات سمجھا نہ سکنے کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ فیمنسٹ عورتیں ہر آندھی، طوفان، بارش یا زلزلے کا ذمہ دار مرد کو ٹھہراتی ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب، جب یہ سوال کرتے ہیں کہ ''کیا تانیثی تنقید کے ذریعے عورت اپنے مادری نظام کے کھوئے ہوئے شجرہ نسب کو حاصل کر سکتی ہے؟''

تو اس سوال کے پیچھے بھی (معذرت کے ساتھ) پدرسری معاشرے کا خوف نظر آتا ہے۔ اسے خدشہ ہے کہ کہیں عورت اپنی عظمت رفتہ کی، اپنے تاج و تخت کی دعوے دار بن کر تو سامنے نہیں آ گئی؟ یہ خدشہ شاید اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ feminist متواتر پدرسری معاشرے

Scanned by CamScanner

کی مذمت کرتے نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف عالمی سطح پر عورتوں کی لیڈر شپ کے امکانات بھی نظر آ رہے ہیں لیکن اردو ادب میں شاعری اور تنقید میں کہیں اس نوعیت کی قرارداد نظر نہیں آتی کہ اس پدرسری معاشرے کی جگہ ایک مادرسری معاشرہ قائم ہونا چاہیئے۔ آج کی عورت تو ہر جگہ عدل پر مبنی ایک معاشرے کی بات کرتی نظر آتی ہے۔ دوسری جانب مرد طبقہ بھی اس کا ادراک و فہم کرتا جا رہا ہے کہ پدرسری معاشرہ ختم کر کے وہ کوئی قربانی نہیں دیں گے بلکہ ایک ایسا معاشرہ جس کی بنیاد مساوات اور عدل پر ہو مرد اور عورت دونوں کی ضرورت ہے۔ اسی ادراک فہم کی وجہ سے آج کئی مردانہ نام بھی نسائیت کے لئے لکھنے والوں میں موجود ہیں۔

اسی طرح یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ نسائیت کے موضوع پر صرف خواتین لکھنے والوں کی اجارہ داری ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ مرد نسائی حسیت یا نسائی شعور نہیں رکھتے لہٰذا نہ وہ آج تک عورت کو سمجھ سکے نہ اس کے ادب کو۔ ہزار سال سے پدرسری معاشرے میں رہنے کی وجہ سے نسائی شعور کو زنگ لگ گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بعض اوقات عورت خود بھی نسوانیت کے بعض پہلو سمجھنے سے قاصر ہے۔ لیکن عورت بہر حال انسان ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ

> ''عورت نہ تو مافوق الفطرت ہے، نہ اساطیری شخصیت، نہ ہی پہیلی اور نہ چیستاں۔ وہ گوشت پوست کا پیکر ہے، وہ بھی اعصاب اور غدودوں کی کارکردگی کے تحت عمل اور ردِعمل کا اظہار کرتی ہے۔ یہی نہیں مرد کی طرح وہ بھی معاشرے کی فرد ہے''۔[۳۸]

تو جب برسہا برس سے عورت مرد کے بنائے ہوئے اصول و معیارات، اقدار و روایات، یہاں تک کہ افکار و فلسفہ ہائے حیات سمجھتی اور برتتی چلی آ رہی ہے تو مرد ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ مرد ایسا کر سکتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ دنیا میں جہاں جہاں عورتوں کے حقوق کی تحریکوں نے کامیابیاں حاصل کی ہیں وہاں ان کامیابیوں کے پیچھے عورتوں کے ساتھ مردوں کا بھی ہاتھ تھا۔

Scanned by CamScanner

بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ نسائیت کو نسوانیت اور نسوانیت کو غنایت اور رومانس کے مترادف کے طور پر استعمال کرلیا جاتا ہے۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے کہ عورتیں رومانس اسقدر شوق سے کیوں پڑھتی ہیں؟ لیکن نسائیت کے نظریات اور رجحانات کو رومانس کی ذیل میں رکھ دینا بڑی غلطی ہے۔ feminism کی تو بنیاد ہی حقیقی اور عملی زندگی پر ہے۔ خارجی حقیقتوں کا تجزیہ اور ان سے جڑے مسائل سے نسائی ادیب منہ نہیں موڑ سکتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ چیزوں کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس تحریک کے عملی رخ کو نظر انداز کر کے صرف نظریاتی مباحثے کرنا فیمنسٹ تنقید نہیں۔

ایک غلط فہمی، بالخصوص پاکستان میں، نسائیت یا فیمنزم سے متعلق یہ بھی رہی ہے کہ یہ طبقہ اعلیٰ یا elites کا ایک فیشن ہے اور بس۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں تعلیم، انصاف، صحت سے لے کر لے کر شعر و ادب تک ہر چیز صرف طبقہ اعلیٰ کی دسترس میں ہے۔ ورنہ نسائیت کا نظریہ تو بنیادی طور پر طبقاتی نظام کو ہی رد کر دیتا ہے۔ آج تک نسائیت کی تحریک کی سب سے بڑی رکاوٹ سرمائے یا جاگیر کی غیر مساوی تقسیم ہی رہی ہے جو gender کے مسئلے کو اقتصادی مسائل میں الجھا کر مزید پیچیدہ کر دیتی ہے۔

نسائی نقاد کے سامنے ایک بڑا چیلنج یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ ادب مین تخصیص کی مخالفت کرتے کرتے کہیں خود بھی لیڈیز کمپارٹمنٹ بنانے نہ لگ جائے۔ ادبی تاریخ میں عورتوں کے حصے کا اعتراف و سپاس ایک چیز ہے اور انہیں مجموعی دھارے (main stream) سے الگ کر دینا دوسری بات ہے۔ اس جگہ وہ بحث اٹھ کھڑی ہوتی ہے کہ کیا ہم نے ادب میں بھی کوئی elite کلاس تشکیل دے دی ہے؟ کیا ادب میں صف بندیاں ہوتی ہیں؟ اس بحث کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے لیکن اس صف بندی کی سیاست میں خواتین قلمکاروں کا مسئلہ بڑی گھمبیر صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ مسئلہ قرۃ العین حیدر کا نہیں جو بلا روک ٹوک پہلی صف، بلکہ اس سے بھی آگے جا کھڑی ہوتی ہیں۔ مسئلہ تو ان خواتین کا ہے جو صفِ اول میں جگہ نہ پا سکیں اور جنہیں ہمارے

Scanned by CamScanner

مورخ اور نقاد ایک خواتین کا حصہ بنا کر بھگتا دیتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ادب کی تاریخ ازسرِ نو مرتب کی جائے۔ نسائی مورخ کو یہ نئی تاریخ مرتب کرنے کا چیلنج قبول کرنا چاہیے۔

ان سب مسائل و مباحث کے علاوہ بعض چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی ہیں جو نسائی نقاد کے لئے دشواریاں پیدا کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر شدید نظریاتی وابستگی بعض اوقات نقاد کو شدید جذباتی ردِ عمل پر اکسا دیتی ہے طنز کا، استعمال اور جھنجلاہٹ تحریر میں در آتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ نسائیت کے بعض رجحانات ہماری سوسائٹی میں Taboo ہیں اور ان پر لکھنے کے لئے نقاد کو بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔

ان مسائل سے نپٹنے اور صورتِ حال میں تبدیلی کے لئے سماج کے موجودہ ڈھانچے کے ساتھ رشتوں کی نوعیتیں بھی تبدیل کرنا ہوں گی۔ اس کے بعد ہی ایک ایسا معاشرہ اور ایسا نظام قائم ہو سکے گا جس کی بنیاد عدل پر رکھی گئی ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فیمنسٹ نقاد کس حد تک زندگی کے حقائق سے آنکھ ملانے کی ہمت رکھتے ہیں۔

زاہدہ حنا درست کہتی ہیں کہ

> ''آج تخلیقی وفور سے سرشار عورتوں کو اس حقیقت کے ادراک کی ضرورت ہے کہ سماج کے ارتقائی سفر کے دوران جس طرح ایک سنہری موقع مرد کو پدرسری بالادستی کی صورت ہاتھ آیا تھا۔ ایسے ہی ایک انقلاب کا ظہور عورت کو مرد کی طرح مکمل انسان بنانے کے لئے ہو رہا ہے۔ شعر و ادب مصوری، فنون لطیفہ، سائنس اور ٹیکنالوجی کا بحر ذخار سب ہی کی شناوری عورتوں کے لئے کھل چکی ہے۔'' [۳۹]

Scanned by CamScanner

باب سوم

حواشی و حوالہ جات

[1] Cornell Drucila,(1998) AT The Heart of Free dom ; Feminism, Sex and equality, Princeton University Press Princetion -N.J

[2] A Dictionary of Feminist Theroy (1989) ed. Humm Maggie- The woman press, London.

[3] Judith Fetterly, (1977) A feminist Approach to American Fiction, w.r.o Elaine showalter,(1988),

[4] Dictionary of Feminist Theory (1989) ed. Maggie Hmm- The women Press,London

[۵] ایضاً

[۶] ایضاً

[7] Elaine Showalter (1988)

The New Feminist Criticism, Rondom , New York

[۸] آل احمد سرور (۱۹۶۲) نیاز کی ادبیت کے بعض پہلو مشمولہ نگار پاکستان (حصہ اول) ص ۱۱۵

[۹] مجنوں گورکھپوری "مہدی حسن افادی الاقتصادی کا اسلوب نگارش" ۔ بحوالہ ڈاکٹر شارب ردولوی جدید اردو تنقید ۔ اصول و نظریات (۱۹۸۷) لکھنو

[۱۰] عبدالرحمٰن بجنوری (۱۹۶۹) محاسن کلام غالب کراچی ۔ ص ۱

[۱۱] فراق گورکھپوری (۱۹۵۶ء) اندازے ۔ ادارہ فروغ اردو لاہور ۔ ص ۹ ۔ ۱

[۱۲] مجنوں گورکھپوری تنقیدی حاشیے ۔ ص ۹

Scanned by CamScanner

[۱۳] ڈاکٹر شارب ردولوی (۱۹۸۷) جدید اردو تنقید اصول و نظریات، اردو اکادمی لکھنو ص ۳۲۲

[۱۴] ایضاً ص ۲۳۳

[۱۵] میراجی، اس نظم میں، ص ۱۳۷

[۱۶] مجنوں گورکھپوری (۱۹۳۵) ۱۹۶۴، ادب اور زندگی، اردو گھر۔ علیگڑھ۔ ص ۱۹

[۱۷] احتشام حسین (۱۹۵۱) تنقیدی نظریات۔ الہ آباد ص ۱۴۵

[۱۸] احتشام حسین (۱۹۶۳ء)، ذوق ادب اور شعور لکھنو، ص ۱۰۵

[۱۹] ڈاکٹر عظمیٰ فرمان فاروقی (۲۰۰۰ء) اردو کی ادبی تحقیق و تنقید میں خواتین کا حصہ، کراچی یونیورسٹی پریس کراچی

[۲۰] ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی (۲۰۰۲ء) تانیثیت (Feminism) کی تفہیم، مشمولہ سہ ماہی ادبیات اسلام آباد، انتخاب خواتین کا عالمی ادب۔ ص ۱۷

[۲۱] ایضاً ص ۲۰

[۲۲] علی احمد فاطمی (۲۰۰۶ء) ترقی پسند تحریک۔ سفر در سفر ادارہ نیا سفر، الہ آباد۔ ص ۷۹

[۲۳] کشور ناہید (۲۰۰۶ء) ورق ورق آئینہ۔ سنگ میل لاہور ص۔ ۳۲۹

[۲۴] ایضاً ص ۳۲۸

[۲۵] فہمیدہ ریاض (۲۰۰۶ء) ادب کی نسائی رد تشکیل، وعدہ کتاب گھر، کراچی ص ۳۹

[۲۶] ایضاً ص ۱۶

[۲۷] ایضاً ص ۱۲

[۲۸] ڈاکٹر انوار احمد (۲۰۰۵ء) دیباچہ اردو ناول میں تانیثیت ڈاکٹر عقیلہ جاوید، بہاالدین زکریا یونیورسٹی ملتان۔ ص ۱۰

[۲۹] زاہدہ حنا (۲۰۰۷ء) نسائی ادب ایک سرسری جائزہ مشمولہ سہ ماہی ادبیات، اکادمی ادبیات، اسلام آباد
جنوری تا جون ۲۰۰۷ء ص ۳۷۲

[۳۰] ڈاکٹر تنویر انجم (۲۰۰۶ء) مفتیانے اور عورت، مشمولہ ادب کی نسائی رد تشکیل مرتبہ فہمیدہ ریاض۔ ص ۱۰۱۔۱۰۰

Scanned by CamScanner

[۳۱] فاطمہ حسن (۲۰۰۶ء) فیمنزم اور ہم۔ وحدہ کتاب گھر کراچی

[۳۲] ڈاکٹر سلیم اختر (۲۰۰۷) پاکستانی شاعرات۔ تشخص کی تلاش میں۔ مشمولہ سہ ماہی ادبیات، اکادمی ادبیات۔ اسلام آباد۔ ص ۳۴۵

[۳۳] ڈاکٹر عقیلہ جاوید (۲۰۰۵) اردو ناول میں تانیثیت، بہاالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

[۳۴] اردو ناول نگار خواتین۔ ملتان

[۳۵] (۱) سہ ماہی ادبیات پاکستانی اہل قلم خواتین نمبر ۲۰۰۷ء

(۲) سہ ماہی ادبیات انتخاب خواتین کا عالمی ادب نمبر ۲۰۰۲ء

[۳۶] فہمیدہ ریاض، اردو ادب کی نسائی رد تشکیل۔ وحدہ کتاب گھر کراچی۔ ص ۱۲

[۳۷] محمد جمیل احمد، (۱۹۴۴) مقدمہ تذکرہ شاعرات اردو، قومی کتب خانہ بریلی۔ ص ۴۱

[۳۸] ڈاکٹر سلیم اختر (۲۰۰۷ء) پاکستانی شاعرات تشخص کی تلاش میں۔ مشمولہ سہ ماہی ادبیات۔ اسلام آباد ص ۳۴۳

[۳۹] زاہدہ حنا (۲۰۰۷) نسائی ادب۔ ایک سرسری جائزہ مشمولہ سہ ماہی ادبیات اسلام آباد، ص ۳۷۲

Scanned by CamScanner

کتابیات

کتب:

- آل احمد سرور (۱۹۵۴ء) تنقید کیا ہے، اردو اکادمی، سندھ، کراچی۔
- آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس (۱۹۸۱ء)، تاریخ علیگڑھ۔
- احتشام حسین (۱۹۵۱ء) تنقیدی نظریات، الہ آباد۔
- احتشام حسین (۱۹۶۳ء)، ذوق ادب و شعور، لکھنو۔
- اختر حسین رائے پوری (۱۹۴۴ء)، ادب اور انقلاب، بمبئی
- امداد صابری (۱۹۷۴ء) تاریخ صحافت اردو جلد چہارم، دہلی۔
- امداد صابری (۱۹۸۳ء) تاریخ صحافت اردو، جلد پنجم، دہلی۔
- انور سدید (۱۹۹۱ء) اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی۔
- انیسہ بیگم شروانیہ (۱۹۵۴ء) حیات ز۔ خ۔ ش، حیدر آباد، دکن۔
- تاراچند (۱۹۶۹ء) مختصر تاریخ ہند، دہلی۔
- جان اسٹوارٹ مل، عورتوں کی محکومیت۔ ترجمہ (۱۹۹۳ء) افتخار شیروانی، فیروز سنز، لاہور۔
- جمیل جالبی (۱۹۸۲ء) تاریخ ادب اردو، جلد اوّل، جلد دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور۔
- حامد حسن قادری (۱۹۶۶ء) داستان تاریخ اردو، اردو اکادمی سندھ، کراچی۔
- خلیق انجم (۱۹۹۴ء) حسرت موہانی، دہلی۔

Scanned by CamScanner

- رتن ناتھ سرشار (۱۹۸٦ء) فسانہ آزاد، دہلی۔
- زاہدہ حنا (۲۰۰۳ء)، زندگی کا زنداں، کراچی۔
- زاہدہ خاتون شروانیہ (۱۹۴۱ء) فردوس تخیل (کلیاتِ نظم) مرتبہ انیسہ بیگم شروانیہ۔
- سبطِ حسن (۱۹۷۵ء) پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، مکتبہ دانیال، کراچی۔
- سجاد ظہیر (۱۹۷٦ء) روشنائی، کراچی۔
- سردار جعفری (۱۹۵۷ء) ترقی پسند ادب، علیگڑھ۔
- سرسید احمد خان (۱۹۸٦ء) اسباب بغاوتِ ہند، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔
- سلیم اختر (۱۹۷۴ء) تنقیدی دبستان، مکتبہ عالیہ لاہور۔
- سلیم اختر (۱۹۹۳ء) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل، لاہور۔
- سیمیں ثمر فضل (۱۹۹۱ء) ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ، دہلی۔
- شارب ردولوی (۱۹۸۷ء) جدید اردو تنقید۔ اصول و نظریات، اردو اکادمی لکھنؤ۔
- شاہدہ بانو (۱۹۹۰ء) ڈاکٹر رشید جہاں۔ حیات اور کارنامے لکھنؤ
- شرافت حسین (س۔ن)۔ عورت، مذہب اور حکومت، نسیم بک ڈپو لاہور۔
- عابدہ سمیع الدین (۱۹۹۱ء) ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ مشمولہ خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ۔
- عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقاء۔ انجمن ترقی اردو، کراچی۔
- عبدالرحمٰن بجنوری (۱۹٦۹ء) محاسن کلامِ غالب، کراچی۔
- عبدالحلیم شرر (س۔ن)، بدرالنساء کی مصیبت، ادبی پریس لکھنؤ۔
- عبدالشکور، (۱۹۴٦ء) حسرت موہانی، آگرہ۔
- عبدالقادر سروری (۱۹۳۴ء) حیدرآباد کی تعلیمی ترقی گزشتہ ربع صدی میں۔ دکن۔
- عبدالحیٔ صفا بدایونی (سنہ ندارد) شمیمِ سخن مطبع امداد الہند و عین الاخبار۔ مراد آباد۔

Scanned by CamScanner

- عتیق احمد صدیقی (۱۹۸۱ء) بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، دہلی۔
- عصمت جمیل (۲۰۰۱ء) اردو افسانہ اور عورت، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔
- عظمیٰ فرمان (۲۰۰۰ء) اردو کی ادبی تحقیق و تنقید میں خواتین کا حصہ، کراچی یونیورسٹی پریس، کراچی۔
- عقیلہ جاوید (۲۰۰۵ء) اردو ناول میں تانیثیت، بہاالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔
- علی احمد فاطمی (۲۰۰۶ء) ترقی پسند تحریک۔ سفر در سفر، الہٰ آباد۔
- فاطمہ حسن (۲۰۰۶ء) فیمینزم اور ہم۔ وعدہ کتاب گھر، کراچی۔
- فراق گورکھپوری (۱۹۵۶ء) اندازے، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ۔
- فرمان فتح پوری (۱۹۷۶ء) اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، لاہور۔
- فرمان فتح پوری (۱۹۷۱ء) قمر زمانی بیگم، ادارہ مصنفین، لاہور۔
- فرمان فتح پوری (۱۹۸۲ء) اردو افسانہ اور افسانہ نگار، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔
- فرمان فتح پوری (۲۰۰۹ء) صرف شاعرات، الوقار، لاہور
- فصیح الدین رنج (۱۹۶۵ء) بہارستانِ ناز مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلسِ ترقی ادب۔ لاہور۔
- فہمیدہ ریاض (۲۰۰۶ء) ادب کی نسائی رد تشکیل، وعدہ کتاب گھر، کراچی۔
- قرۃ العین حیدر (سنہ ندارد) کارِ جہاں دراز ہے (حصہ اوّل و دوم)۔ لاہور
- کشور ناہید (۲۰۰۶ء) ورق ورق آئینہ، سنگِ میل، لاہور۔
- کشور ناہید (۱۹۸۸ء) عورت خواب اور خاک کے درمیان، سنگِ میل، لاہور۔
- گوپی چند نارنگ (۲۰۰۶ء) جدیدیت کے بعد، سنگِ میل پبلی کیشنز۔ لاہور۔
- گوپی چند نارنگ (۲۰۰۰ء) ادب کا بدلتا منظر نامہ: اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، سنگِ میل، لاہور۔
- مبارک علی (۱۹۹۶ء) تاریخ اور عورت۔ فکشن ہاؤس، لاہور۔

Scanned by CamScanner

- مجنوں گورکھپوری (۱۹۶۴ء) ادب اور زندگی، اردو گھر، علیگڑھ۔
- مجنوں گورکھپوری (س۔ن) تنقیدی حاشیے، دہلی۔
- محمد امین زبیری (۱۹۵۶ء) مسلم خواتین کی تعلیم، آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس، کراچی۔
- محمد جمیل احمد (۱۹۴۴ء) تذکرہ شاعرات اردو، قومی کتب خانہ، بریلی۔
- مہر عبدالحق (۱۹۹۳ء) ہندو صنمیات، بیکن بکس۔ ملتان۔
- میراجی، (س۔ن) اس نظم میں، لاہور۔
- نذیر احمد دہلوی (۱۹۹۴ء) مراۃ العروس، سنگِ میل، لاہور۔
- نذیر احمد دہلوی (۱۹۹۴ء) بنات النعش، سنگِ میل، لاہور۔
- نصیر الدین ہاشمی (۱۹۵۲ء) دکن میں اردو، لاہور۔
- نصیر الدین ہاشمی (۱۹۸۵ء) دکن میں اردو، ترقی اردو بیورو، دہلی۔
- نیلم فرزانہ (۱۹۹۲ء) اردو کی اہم ناول نگار خواتین، علیگڑھ۔
- نیاز فتحپوری (۱۹۹۳ء) عورت اور فنونِ لطیفہ، حلقہ نیاز و نگار، کراچی۔
- ہاشمی فرید آبادی (۱۹۸۳ء) پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی۔

Scanned by CamScanner

رسائل و جرائد

- سہ ماہی ''ادبیات'' اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جلد ۱۵، ۱۴، شمارہ ۶۰۔۵۹ (۲۰۰۲ء)، انتخاب، خواتین کا عالمی ادب خصوصی شمارہ
- سہ ماہی 'ادبیات''، اکادمی ادبیات پاکستان، جلد ۱۸ شمارہ ۷۵/۷۴، جنوری تا جون (۲۰۰۷ء)، پاکستان اہل قلم خواتین۔ خصوصی شمارہ۔
- ''اردو ادب'' حسرت نمبر علی گڑھ (۱۹۵۱ء)
- ''افکار'' کراچی، مارچ (۱۹۷۴ء)
- ''انداز ے'' الہ آباد، شمارہ (۲۰)
- ''سیپ'' کراچی
- ''صحیفہ'' لاہور، اپریل (۱۹۶۸ء)
- ''عصمت'' کراچی، جولائی، اگست، سالگرہ نمبر (۱۹۶۴ء)
- ''عصمت'' کراچی، دسمبر (۱۹۶۷ء)
- ''عصمت'' کراچی، اپریل (۱۹۶۱ء)
- عصری ادب، دہلی خواتین نمبر، شمارہ (۴۱۔۴۲)
- ''نقوش'' لاہور، آپ بیتی نمبر (حصہ اوّل) (۱۹۶۴ء)
- ماہنامہ ''نگار''۔ نیاز نمبر (حصہ اوّل) (۱۹۶۲ء)
- ماہنامہ ''نگار''۔ حسرت نمبر (۱۹۵۲ء)، لکھنو

Scanned by CamScanner

ویب سائٹ:

- Britannica Concise Encyclopidia http://www.britannica.com
- Merrium- Webster On-;ine Dictionary
- http:// www .merrium-webster.com
- Stanford Encyclopidia of Philosophy
- http://plato. stanford.edu/cgi
- Journal of South Asian Women's Studies http:// www.asiatic.org
- http://www.nau.edu/wst
- http://www.feminist.org

انگریزی کتب:

- Barbara Claire Freeman (1995) The Feminine Sublime,University of California Press,California.
- Barbara Johnson(2002) The Feminist Difference: Literature,Psychoanalysis ,Race and Gender,Harvard University Press, Chicago.
- Betty Frieden (1963) The Feminine Mystique, Norton & Co,New York .
- C.Weedon (1999) Feminism-Theory and Political Difference,Blackwell, Oxford.
- Cathrine Mckinnon (1989) Towards a Feminist Theory of the State, Havard University Press, Chicago.
- Collins Dictionary and Thesaurus (2006) Collins, Lomdon.

Scanned by CamScanner

- Cornell Durcilla (1998) At Heart of freedom: Feminism,Sex and Equality Princeton University Press, Princeton ,N.J
- Davidoff (1986) Women,s History, Women's Work, Macmillon,London.
- Elaine Showalter (1988)The New Feminist Criticism, Random House, New York.
- Friedrich Engels (1972) The Origin of the Family ,Private Property and the State,Inter national Publishers, New York.
- Jackson and J.Jones(1998) Contemporary Feminist Thories, Edinburgh University Press, Edinburgh.
- Maggie Humm (1989) A Dictionary of Feminist Theory,The Women Press,London.
- Nancy Cott (1987) The Grounding of Modren Feminism,Yale University Press.
- Nighat Saeed Khan, Unveiling the Issues,ASR Publication Lahore.
- Nighat Saeed Khan(1998),A Celebration of Women.ASR Publication Lahore.
- R.Khanum (2002) Muslim Feminism and Feminist Movement Central Asia ,Global Vision House.
- S.Walby (2000) Feminist Thory ,Routledge,London.
- Simone de Beauvior (1974) The Second Sex , Translated and edited by H.M Parshley, Vintage Books , New York.

Scanned by CamScanner

رائے

ڈاکٹر عظمیٰ فرمان فاروقی کی تصنیف ''اردو ادب میں نسائی تنقید (روایت، مسائل و مباحث)'' اس لحاظ سے ایک منفرد تصنیف ہے جس میں مغرب کی نسائی تحریک پر گہری نگاہ کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں نسائیت کی تحریک کا تحریکِ ترقی نسواں کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ مغرب کی نسائی تحریک کا زیادہ زور مرد فکشن اور ڈراما نگاروں کی تحریروں میں خواتین کرداروں کی ''زبان'' میں بھی پدرسری سماج میں موجود جنسی چھاپ پر ہے۔ اردو ادب کی نسائی تنقید جولیا کرسٹیوا کے انداز کی تنقید نہیں بن سکی۔ اس کا تمامتر زور نسائی تحریک میں مساواتِ مرد و زن کے تصور پر ہے۔ ڈاکٹر عظمیٰ فرمان فاروقی نے اس تحریک میں بائیں بازو کی سیاست کی بجائے ترقی نسواں پر زور دیا ہے۔

ڈاکٹر عظمیٰ فرمان فاروقی کی تصنیف اردو ادب میں نسائی تنقید ہر لحاظ سے ایک جامع کاوش ہے۔ میرے خیال میں اس کتاب کے ذریعے نسائی تحریک کے وکلاء ایک اہم رخ کا مطالعہ کر سکیں گے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی
ڈین، بزنیک یونیورسٹی
کراچی

ISBN NO. 978-969-9487-02-6 Price : Rs.200/-

سعید Saeed Publications
002 Home Land Appartment, Block- 13-C, Gulshan-e-Iqbal, Karachi.
Contact: 021-34830127, 0300-2939503 E-mail: aisha_burney@live.com

Scanned by CamScanner